عبداللہ II

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہاشم ندیم

عبداللہ...... جو میرے، تمہارے اور ہم سب کے اندر جانے کہاں چھپا بیٹھا رہتا ہے...... دورِ حاضر کا مقبول ترین ناول

عبداللہ II

ہاشم ندیم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	عبداللہ-II
مصنف	ہاشم ندیم
ناشر	گل فراز احمد علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	اکرم، شیر محمد طاہر
کمپوزنگ	ظفر اقبال
سن اشاعت	جنوری 2011ء
قیمت	=/500روپے

ملنے کا پتہ

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون 042-7352332-7232336

ادارہ علم وعرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انتساب!

عبداللہ کے نام

جو میرے، تمہارے اور ہم سب کے
اندر جانے کہاں چھپا بیٹھا رہتا ہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فہرست

1- عبداللہ 07

2- جبروت 09

3- دوسرا سورج 15

4- خواب اور سراب 21

5- لاحاصل کی کھوج 27

6- رُوح کا عکس 33

7- دشمن زندہ رہے 40

8- دل سے دھواں اُٹھتا ہے 47

9- قفس اور جبر 54

10- کبھی ہم بھی خوبصورت تھے 61

11- اک نئی جنگ 68

12- معصوم سے معصومیت تک 76

13- پہلا کفارہ 82

14- دھانی 89

15- لفظ گر 96

16- میرا ہر لفظ تمہارا ہے 104

17- لفظ رُوٹھ جاتے ہیں 111

18- تم بھول جاؤ گے 118

19- شالیمار 125

20- قاتل 131

21- قفس اور جنوں 137

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

22- لہو کا لباس 143
23- آدھا چہرہ 149
24- رُوپ بہروپ 155
25- ہم زاد 161
26- آدھا جنوں، آدھا فراق 167
27- گلابی دھند 173
28- “ہوش والوں کو خبر کیا......” 179
29- کاسا بلانکا 184
30- “ایک محبت اور سہی” 190
31- آخری محبت 196
32- “من کی دیوار” 202
33- پہلی قیامت 208
34- 21 دسمبر 2012ء 214
35- صیہونی 220
36- آخری مسیحا 226
37- مناظرہ 232
38- ایک اور عبداللہ 239
39- جانشین 245
40- فریفتہ 251
41- “جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے” 258
42- “دوسرا رقیب” 265
43- تارِ عنکبوت 272
44- دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے 279
45- “کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا” 286

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عبداللہ

عبداللہ کے پہلے حصے، 29 اقساط کا خلاصہ

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کار ریس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری وش زہرا کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ لیکن زہرا کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک کھینچ لاتا ہے، جہاں اُس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو عبداللہ کے اُستاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں اُلجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اُکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کر لے تو کوئی اس دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے۔ لیکن تب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرا کسی اور کی نہیں خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھائل ہے۔ لیکن عبداللہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرا کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آ بیٹھتا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ”عبداللہ“ کی شناخت ملتی ہے۔

سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرا بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے۔ لہٰذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے لیکن اپنا سب کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخر کار ساحر کے والدین اس کی بٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ رُوح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس بار اُس کی منزل درگاہ نہیں بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دور دراز کی سینٹرل جیل ہے جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح طے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود کبھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے۔ نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رُباب کی حویلی بنتی ہے جہاں یاقوط نامی ایک جن زادہ رُباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو شکست دینے کے لئے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رُباب یاقوط کے چُنگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جبل پور روانہ کر دیتے ہیں جہاں راستے میں زہرا کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے

عذاب سے بچانے کے لئے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست برد سے نکل آتی ہے لیکن خود جبل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارا، لاریب عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرا کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرا کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرا کو جبل پور طلب کر لیتا ہے۔ لیکن خود زہرا اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرا کی سچائی اور اس جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرا عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی رُوح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جبل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

❀……❀

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com

جبروت

میری آوارگی میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی محسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو ٹرینیں بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اُوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دوپہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے بگولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور سالوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے جیسے کوئی صدیوں کا بچھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے۔

گرم لُو کے تھپیڑے چہروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگویا اور سر اور چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں مسکرا کر ٹال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید ”لُو“ تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھونکے بھلا مجھ کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لئے خزاں ٹھہر گئی ہو انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔ گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اُڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی لوہے کی پٹری بھی جگہ جگہ ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لئے ٹرین کی رفتار اب کافی مدھم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قنات نما کپڑے کی رسی لئے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے انہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لئے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگویا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لئے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُو کے گرم تھپیڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا وہ جلدی سے دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اُوپر سرک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لئے متعین عملے کو خاص بیلچوں کی مدد سے ٹرین رُکوا کر ریت ہٹانا پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک اس سرکتی ریت اور بدلتے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ اُفق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشی گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی

دیا سلائی سی جلا دی تھی، جواب تیزی سے اُفق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آنچ پہنچا کر سارے فلک کو جلا دینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے ہچکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا۔ جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دھیرے دھیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا "چلو میاں...... ہماری منزل آ گئی ہے"۔

میں اپنے خیالات کی رو ٹوٹنے پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لالٹین کی کمزور سی روشنی کھڑکی کے ملگجے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نما بنچ کو دو بار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اُڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے "آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے"۔

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سناٹے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اُٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور گھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی، اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خدّ و خال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آوز سنائی دی۔

"کن سوچوں میں گم ہو...... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر تھکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلتے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے"۔ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ "نہیں...... ہم ابھی سفر کریں گے...... میں بالکل تازہ دم ہوں"۔ سلطان بابا نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے پلیٹ فارم سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوئی واہمہ ہو۔ لیکن وہم اس قدر جزئیات کے ساتھ نہیں اُترتے۔ بہر حال میں سر جھٹک کر صحرا میں آگے بڑھتے سلطان بابا کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ جن لوگوں نے صحرا کی ڈھلتی رات کو جیا ہے، وہ اس کے سحر سے ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پوری کائنات ایک آسمان بن گئی ہو اور اس پر چمکتے ان گنت تارے مجھ سے سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ "ہمیں چھوڑ کر کہاں چل دیئے؟" رات کے وقت صحرا خود ایک لامتناہی سمندر کی طرح نظر آتا ہے۔ بس ہر موڑ پر ایک نیا سراب چھل دینے کے انتظار میں کھڑا ملتا ہے۔ جانے یہ تارے صحرا میں اتنے روشن اور چمک دار کیسے ہو جاتے ہیں، میرے مقدر کا ستارہ تو سدا کا دھندلا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم ایک صحرائی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ بستی کیا تھی، بس ویرانہ ہی تھا۔ کچے گھروں کی طویل قطاریں دُور دُور

تک صحرا میں پھیلی ہوئی تھیں جنہیں کیکر نما ایک جھاڑی کی باڑھ سے ڈھکا گیا تھا۔ بستی کی زبوں حالی اور غربت ان کچے جھونپڑوں ہی سے ظاہر تھی۔ البتہ کچھ آگے بڑھنے پر چند پکی عمارتیں اور پھر خاکی رنگ کی ایک بہت بڑی سی قلعہ نما عمارت بھی نظر آئی۔ شاید پوری بستی میں یہی ایک واحد عمارت تھی جہاں بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی گھر رر...... کی سی آواز سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اُجالا کسی بہت بڑے جنریٹر کا مرہون منت ہے۔ میں نے بستی کی ٹیڑھی میڑھی، اینٹوں سے چُنی سڑکوں اور کچی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات بھی محسوس کی کہ کسی ایک آوارہ کتے نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پوری بستی میں کوئی کتا تھا ہی نہیں۔ بس ایک لرزا دینے والا سناٹا طاری تھا۔ اب بستی کا باقاعدہ بازار ختم ہو رہا تھا اور دُور چند گلیوں سے پرے صحرا میں ایک ٹیلے پر ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ بستی ختم ہو جانے کے بعد میں جس روشنی کو بہت قریب سمجھ بیٹھا تھا، صحرا میں وہ عمارت اور وہ چراغ بھی بہت دُور نکلے۔ چراغ نے دھیرے دھیرے ایک بڑی سی گیس بتی کی شکل اختیار کر لی اور ریت کا ٹیلا دھیرے دھیرے صحرا میں کھڑے ایک بوسیدہ مزار کی عمارت کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہی زرد اینٹوں سے چُنا گیا صدیوں پرانا مزار ہماری منزل تھا، جو صحرا میں ریت کے ایک بہت بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دُور بستی کے کچے گھر اور وہ قلعہ بچوں کے بنائے گھروندوں سے معلوم ہو رہے تھے۔

مزار کا بوسیدہ لکڑی کا گیٹ تیز ہوا سے جھول کر اس سناٹے میں ایک عجیب سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ جیسے نئے آنے والے مہمانوں سے اپنی بے کسی کی فریاد کر رہا ہو۔ مزار کا صحن بھی انہی کچی اور پیلے رنگ کی اینٹوں سے جڑا گیا تھا جس کا استعمال قصبے کی سڑک میں نظر آیا تھا۔ صحن سے کافی پرے چند بوسیدہ کمرے اور وسط میں ایک گنبد تھا، جس کے اُوپر کی گئی پتھریلی اور منقش مینا کاری ماہ و سال کی گردش کے سبب جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی اور مزار کی چھت پر کھڑا یہ عظیم گنبد اس وقت خود کسی سجدے کی سی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً میرے دل میں وہی پرانا سوال پھر سے جاگ اُٹھا ''لوگ ان مزاروں پر کیوں آتے ہیں۔ ان برستی ویرانیوں کا ہمارے دل کی ویرانی سے کیا رشتہ ہے؟'' آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبداللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرا ہی میرا مقصد تھی تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا۔ تو پھر زہرا کے بعد وہ کون سا مقصد تھا جو مجھے ان ویرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے باجماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ ان دیکھی دیا سلائی سُلگی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لئے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لئے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرے بھر سے گئے مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں...... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی

تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے۔ دھیرے سے مسکائے ”بھئی یہاں کی ہر چیز میں تمہیں اس ریت کا ازلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کال گڑھ والے اب اس ریتلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔“ ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتا صرف اس لیے چھوڑ کر اُٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دیسی یا بدیسی کارن فلیکس ہوتا تو سارا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے انجان موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے…… کس کو خبر……؟

کچھ ہی دیر میں سورج کا گولا مشرق سے بلند ہوا اور آناً فاناً جیسے ہر چیز کو آگ سی لگ گئی۔ میں نے صحرا کی گرمی اس سے پہلے کبھی نہیں جھیلی تھی۔ کبھی پاپا یا کاشف کے ساتھ شکار یا کیمپ فائر کے لئے جانا ہوا بھی تو ہمارے ساتھ بڑے بڑے جنریٹر ہوتے تھے اور ہمارے خیموں کو ٹھنڈا کرنے کا پورا اہتمام ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ لیکن یہ تپش…… دو گھنٹوں میں ہی مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میرے وجود کے ساتھ ساتھ رُوح بھی پگھل کر بہہ جائے گی۔ یہ نیلا آسمان ایسے قہر بھی برساتا ہوگا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کال گڑھ ایک صحرائی بستی تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قحط ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آبِ حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا۔ قصبے میں نوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں۔ جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درسِ قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ لہٰذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا ”آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعے داروں کا اسرار مجھے سمجھ نہیں آیا۔“ میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ”عبداللہ میاں…… ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے۔ وہاں کا بڑا قلعے دار۔ سارا علاقہ کانپتا ہے جبروت کے نام سے……“ ”جبروت……؟؟ یہ کیسا نام ہے……؟“ ”نام تو ماں باپ نے شاید جابر رکھا تھا، جو پیار سے جبرو ہوا اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔“ جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔ کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوتوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر ایک برائے نام ہی تھانہ نما عمارت

میں چار چھ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تو تھا لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے سارے مقدمے اُسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی اُن کا فیصلہ کرتا تھا۔ اُس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی بنا رکھی تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری پتھروں سمیت پھر سے تہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ سارا قصبہ جبروت کے دیئے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے قحط نے کال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تین بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہوئے خوں خوار کتے تھے، جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد بچپن ہی میں ماں کی گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود ہی کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرہ اور نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی جب تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نویلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس گنتی کو تین کرنے میں جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی ہیضے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ''انہونی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ''قدرت کے لکھے'' کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ لیکن چار کی گنتی پوری کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُوب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظار کرنے لگتا۔ ہاں البتہ اس کی دل چسپی اگر سدا کسی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑیا نما کتوں کی دیکھ بھال اور نشوونما۔ سنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ انہی بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹہلائی کے لئے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پانی ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زد عام تھا۔ کہنے والے کہتے تھے جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہٰذا اپنے دشمنوں کو مروانے سے پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس اسے جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ ملزم کو کال گڑھ کا تپتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہوئے سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سرپٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد جبروت کے خون خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیے جاتے تھے کہتے ہیں کہ آج تک ایک ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گونجا ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی رُوح کو پہلی سلامی

کے لئے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ وہ شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ لہٰذا اسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہیں چل پایا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم دونوں سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز اُبھری "جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے"۔ میں اُچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلقت کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسبِ معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اسی سوچ و بچار میں شام بھی ڈھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات تاروں بھرا آنچل لئے ہمارے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا "اب تم بھی ذرا کمر ٹکا لو عبداللہ میاں...... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔" لیکن میری بنجر آنکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور حبس سے پریشان ہو کر مزار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر چمکیلے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر مسکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرا کا تارا تلاش کرنے کے لئے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے مزار کے صحن کے باہر میں نے کسی کے پھولوں بھرے آنچل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں...... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس ویرانے میں آدھی رات کو اس مزار تک بھی آ پہنچی، کیوں......؟؟؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدوخال مجھ سے چھپا رہا تھا آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جیپ نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمحے بھر کو صحرا کی جانب ہٹی، جہاں دور تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی ہوئی مزار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو آتا دیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈل کی ولیز جیپیں ہی تھیں جو اب بالکل مزار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غرانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کود کر نیچے اُترا اور اس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دراز قد ہیولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں لہٰذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دراز قد شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ اچانک جبروت کے عقب سے ایک خون خوار کتا میری جانب لپکا۔

◆......◆

دوسرا سورج

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غراہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی، ”ناں..... کالے!!“ اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زقند بھرنے کے لئے تیار اور اپنے خوں خوار جبڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ”کون ہو تم..... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“ ”عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لئے آئے ہیں۔“ جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ”او ہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟“ ”وہ آرام کر رہے ہیں..... لمبے سفر کی تھکن ہے۔“ جبروت نے لمبا سا ہنکارا ابھرا ”ہوں..... اور جانے کے لئے پلٹا۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رک گیا ”ہیڈ ماسٹر سے کہنا کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوا دے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔“ جبروت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیپ کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں ہڑبڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ”کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟“ سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ”بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔“ وہ درپردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔ میں نے اکرام اللہ کو ساری تفصیل بتا دی جسے سن کر اُن کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری مانیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لئے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔“ سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اُٹھایا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑبڑائے۔ ”اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟“

”نہیں۔ ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا۔ اگر میرا پوچھیں تو کہیے گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔“ اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے اُلٹے قدم لوٹ گئے۔

رفتہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا۔ جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رُخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے

چلتے اپنے سورج کی دوسری جانب تو نہیں آ پہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا۔ ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا اَن جان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کیے۔ تسبیح پھیر رہے تھے میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ "کیوں میاں...... کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔"

جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہ راست لو سے بچنے کے لئے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی جھولتی ہوئی کھڑکی کے اُوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چق اور چند کپڑے کی کترنیں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی گئی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے مچلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ "ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے اردگرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں......؟ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہ رگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا بسیرا ایسی ہی کسی ویران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے......؟" انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ "اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنی رگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لئے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ایک نشانی ہے۔ بس اتنا ضرور یاد رہے...... یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانہیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کمخواب کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہنا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔" میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ "لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔" سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا۔ "اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلا اس میں کہیں نہ کہیں ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔" میں نے چونک کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دُور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ ہاں! سچ ہی تو تھا۔ اس سارے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی۔ ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والے ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ ایک دم ہی میرے رونگٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنا بھی پڑی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلاد کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا۔ میں نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ "لیکن کیوں...... اس بے اختیاری کی منزل سے گزرنا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور کسوٹی سے

کیا حاصل......؟'' ''سارا کھیل ہی تو اس اختیار بے اختیاری میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حدود ہیں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ آجائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔'' جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھو ڈنک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں اُلجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا جب بستی کے کچھ اینٹوں والے بازار میں اُونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید و فروخت جاری تھی۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بنڈل پھاڑ کر گاہکوں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اُتروائے جا رہے تھے۔ سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے بیچ ایک کاریگر سامنے ٹب میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روئی دُھن رہا تھا اور فضا میں اُڑتے اُون اور روئی کے ننھے بگولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے نکڑ پر ایک ماشکی پرانی سی مشک میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اُون دھننے والے کے اوزار کی دُھن دُھن، اُونٹوں کی جرس، بھیڑ بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے جلتے الاؤ کی دھونکنی اور ماشکی کے آوازے...... سب مل کر چند لمحوں کے لئے اس مردہ کال گڑھ کو کسی قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیوہیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا تو ان کرب ناک چیخوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اُونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا اُس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ ریچھ اپنا خون خون بدن لئے کھڑا اچھل رہا تھا اور جبروت کے آٹھ خوں خوار کتے چاروں طرف سے اس بیڑیوں میں جکڑے قیدی ریچھ پر حملے کر رہے تھے۔ ریچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی نکیل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدتا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے ریچھ کو انتہائی حد تک خطرناک کر دیا تھا۔ اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت بڑھانے کے لئے انہیں چلا چلا کر ہشکا رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بہتے کف کی طرح اس کی رال بھی فرط جوش سے بار بار ٹپک رہی تھی۔ جب کوئی کتا ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو

جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے پنجے کے تھپیڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور اُن کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ اُن پر غراتا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اُکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دُور ہانک دیتے تھے۔ ان میں وہ کتا بھی شامل تھا جسے جبروت نے رات ”کالے“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً ریچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اُسے ریچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ ریچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر کر دی اور میں نے اتنی دُور کھڑے ہونے کے باوجود اس کان پھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹخنے اور پھر ٹوٹ کر تڑکنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گرتے ہی چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی اثناء میں ریچھ کا پنجہ پوری قوت سے لہرایا اور ”کالا“ ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جا گرا اور گرتے ہیں بے سدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ”مرنے دے اس مردار کو۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو.....“ آٹھ میں سے دو کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جبروت نے جھولتے اور ڈگمگاتے ریچھ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولیے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلی تھاپ سنتے ہی ادھ مرے کتوں میں جیسے بجلی کی لہر سی کوند گئی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سمیٹے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہراتا ریچھ رومن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈی ایٹر (Gladiater) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اُتار دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے نرخرے میں اپنے خونی جبڑے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے نرخرے سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشائیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھوتھنی اور نکیل والے حصے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ گلیڈی ایٹر ہار چکا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشائیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جثہ بے دم ہو کر زمین چھونے کے لئے آخری بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اُٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لئے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جبروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولیے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر جبروت کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکرے کا منہ کھولا اور ایک شان دار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جبروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جبروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر

راشن دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آٹے، چاول اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جبروت اس ہنگامے کی وجہ سے میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پژمردہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پرنم آنکھیں اور اس کا ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنا دی تھی کہ میں کیوں اتنا گم صم سا واپس لوٹا ہوں۔ مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیوں میاں...... کچھ سمجھ میں آیا یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معمے کی ایک کڑی ہی تو تھی۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ''وہ کیسے؟'' ''بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا۔ اور آٹھ جانب سے لپکتے وہ حملہ آور وہ مجبوریاں، جرم گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے جو ہم ساری عمر جھیلتے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب سے اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کے ناک میں ڈلی نکیل ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت میں بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیاری کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔'' مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معمہ بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ''بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے۔ لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہیولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ شبیہ تمہیں دکھائی دے تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کا فسوں بڑا گہرا ہوتا ہے۔''

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اُجالا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ سے ہی میرے لئے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوائے دوش پر مجھے دور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک میں اس آواز کو بھی اپنا واہمہ ہی سمجھتا رہا لیکن پھر سلطان بابا کی کہی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ''ہاں...... واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔'' لیکن یہ مدھر لے تو لگاتار اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم

بڑھائے جہاں سے آواز رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر آہٹ کی آواز سنتے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی دھیمی سی آواز میں بولا ”نوری...... تم ہو......؟“ میں ٹیلا پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی...... ”میرا نام عبداللہ ہے۔ میں صحرا کے مزار کا نیا خدمت گار ہوں تم کون ہو......؟“ چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ”اوہ...... میں کچھ اور سمجھا تھا۔ نیچے آ جاؤ۔ میرا نام سانول ہے۔ میں یہیں کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔“ لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروا دیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا ”تم بانسری اچھی بجا لیتے ہو۔ لیکن اتنی دور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو......“ اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کر لوں۔ پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”مجاور بن کر کیا کرو گے؟ مجاور تو بانسری بھی نہیں بجا سکتے۔“ ”وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔“ ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ پر تم مجھے کچھ دوسری قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں۔ تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔“ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا جو میرے ذاتی کلیکشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی ایل ڈیز سے میرے کمرے کے شیلف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لئے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب، ڈسکو ہر جگہ ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہچکچایا۔ ”اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا۔“ ”نہیں نہیں۔ تم بجاؤ۔ مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اُس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اس کی نظریں بانسری بجاتے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دُھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ وار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ گونجا۔ ”اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہکار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سراہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے۔“ انہیں سوچوں میں گم میں سانول کی بانسری کی مدھر تان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دور اُسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں...... وہی تھی...... بڑا سا پلو لیے۔ میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلاہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور گھبرا کر بولا۔ ”یا اللہ خیر...... کیا ہو گیا......؟“

* * *

خواب اور سراب

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ”وہ...... لڑکی......“ سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا یہی وہ چند لمحے تھے جب میری توجہ اُس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی۔ لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر ان دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تم بھی اس صحرا کے چکر میں آ گئے نا۔ معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ بُرا نہ مانو تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں......؟“

”تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔ لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں“۔ اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ”اچھا......؟؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔“ میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دہرا دیا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سا رنگ، ماتھے پر بندیا...... تم کہو تو ایسی دو درجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوا لوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟“ میں سانول کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ ”خاص نشانی......؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟“ سانول نوری کا نام سنتے ہی کچھ سٹپٹا سا گیا اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر وہ شرما کر بولا۔ ”نہیں جی...... وہ نوری نہیں ہو سکتی...... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اُس کا نام پکار بیٹھتا ہوں۔ وہ بھلا اس ویرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار پہرے لگے رہتے ہیں۔“ میں نے شرم سے لجاتے سانول کو چھیڑا۔ ”اوہ...... تو یہ بات ہے۔ پر یہ نوری ہے کون؟“ ”نوری میری منگ ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری اُن ہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اس نے۔ پھر اُس کے باپ نے گھر بٹھا لیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لئے گال گڑھ سے بیس کوس دور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔“ سانول شرما شرما کے اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اُس کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسر روزگار نہیں ہو جاتا وہ بیٹی کو رخصت نہیں کریں گے۔ لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود در سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی ان دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقعے پر جبروت کی پنچایت ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرضہ چکاتے اور

اپنے پیاروں کے رشتے کے لئے نئے قرض کی گٹھڑی اپنے شانوں پر ڈالے قلعے سے نکل آتے۔ اسی لئے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے تا کہ باپ بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا سارا قرض اسی سال چکتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے۔ لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اُس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوری کو سات پردوں میں زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا کیوں کہ نوری پر اُس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی۔ اس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آنگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی کیوں کہ جبروت کے حواری اور گرگے آوارہ کتوں کی طرح سارا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے سانول کے بقول، جب سے نوری کے ساتھ اُس کی منگنی طے ہوئی تھی وہ ویسے بھی دہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اُسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندھن اُس کا قصور وار نہیں۔ یہ سارا قصور تو اس محبت کا ہے جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیاں، درد اور لاحاصل پن کی چبھن لے کر آتی ہے۔ جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لئے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لئے کس قدر ناممکن، کتنا لاحاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اُس کی قربت کی دو گھڑی کے لئے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا...... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبوریوں، پریشانیوں، دوریوں اور کرب کا ایک دریا لئے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دو ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکار ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لئے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لئے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچھی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرائے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طنز میں بدل جاتی ہے۔ کل تک پلکوں پر بٹھانے والے تیغ پا ہو کر سرزنش کرنے لگتے ہیں۔ نہ جانے یہ محبت ہمیشہ ہمارے اردگرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسا کیوں اور کیسے کر لیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اُس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لئے صحرا میں اُس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لئے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اُسی وسیع و عریض اور لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ کھڑا پایا۔ سوا نیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی تپتی کرنوں کی برچھیاں لئے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے

تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر ان میں ایک کتا اُچھل کر میرے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں...... یا اللہ...... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب......؟ سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ”خواب تقدیر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے تو آنے والے دنوں میں یہ صحرا تمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا۔ نہ صرف تمہارے لئے بلکہ خود میرے لئے بھی...... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔“

نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی روشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رو رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے۔ لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے اُبھرنے لگی تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اُٹھنا ہی پڑا اور پھر میں تپتی ریت میں پیر دھنساتے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا تو اپنی جگہ جم کر ہی رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ”کالا“ پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے ریچھ نے پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اُچھال کر ہجوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لئے صحرا میں پھنکوا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بُری طرح زخمی تھا اور ریچھ کے خوں خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بُری طرح سے اُدھیڑ دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھونکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے لٹکتی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اُٹھا لایا جس کی تہہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر ٹپکائے تو اُس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کی اصل گہرائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگاتا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار کے بنے طاق کے اندر سے ماچس اُٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹیے یار کو یہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں نے کالے کے زخم کے اُوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں اُسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چند خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی نگلنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں

دکھائی دیا۔ لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ بے زبانی...... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی ایک لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز کر دینے والے...... اور اگر ہماری زندگی سے یہ لفظ نکال دیے جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جس شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو۔ کالے نے اپنے جسم کو تولا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے۔ لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی میں تو بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اُونچے ٹیلے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اُڑتے گرم بگولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا تو اکرام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دے چکی تھی، لہٰذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اُردو نہیں بول سکتی تھی۔ سو بوڑھے ہی کو اُس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا مدعا ٹوٹی پھوٹی اُردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے رحمان گڑھ کے لئے روانہ ہوئی تھی لیکن وہ اور اُس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچ پائے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ ریلوے اسٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور دی تھی کہ انہوں نے اُس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر اُترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانا نانی نے ہی پال پوس کر اسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لئے اپنی دلہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی جدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رُکتے تھے۔ بقول اُس کے اُسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اُس کی سکینہ کی خوشبو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن ابھی تک اُن کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اُس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کی ناکارہ پولیس بھی چند دن کی دکھاوے کی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کروا دیا تھا کہ کون روزانہ ان دو خبطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سکینہ کے نانا نانی نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہرکارے آس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کتے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو ہلکان کرتا۔ لیکن سکینہ کی نانی یہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُسے اب بھی اُمید تھی کہ اُس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ

کہا اور بوڑھے نے اُسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑگڑایا۔ ''میری لگائی سٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، بُرا نہیں ماننا۔ پر یہ کہتی ہے کہ اُسے روزانہ کئی مہینوں سے ہر رات ایک عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سکینہ اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سکینہ زور زور سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے......'' میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی باسیوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑگڑا رہا تھا۔ ''آپ ہمارے لئے دعا کرو پیر جی...... ہم بہت مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دُور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔'' بوڑھا بولتے بولتے بھرا سا گیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا نے اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھڑا بھول کر پلو سے اسکی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا۔ دو مجبور اور بے کس انسان ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے، حالانکہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان کا دلاسا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم ہی میرا دل بھر آیا اور میں نے وہاں سے اُٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اتنے میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی۔ آنے والا سانول تھا، جو وہیں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اُس سے پوچھا۔ ''خیر تو ہے...... کہیں نوری کے لئے کوئی منت مانگنے تو نہیں آئے۔'' وہ مسکرایا۔ ''منتوں سے اگر پیار ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا ویران نہ ہوتا جناب......'' ''واہ...... بڑی بات کہہ دی تم نے۔ کہو کیسے آئے؟'' سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اُسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر دعا کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے یہی بتانے کے لئے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ بُرا نہ مانیں۔ بقول سانول نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اُستاد ہیڈ ماسٹر اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اُس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اُس سے پوچھا کہ ''جہاں اُس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوتا۔'' سانول بھی ہنس دیا۔ ''اُس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے پر مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لئے چنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کی یہی نیاز بانٹا کرتے تھے۔'' یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ''معاونت عشق'' کے جرم میں اس کا پورا ساتھ دوں گا۔ سانول کو پریشان دیکھ کر میں یہی سوچتا رہا یہ پیار اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کانٹے کیوں لے کر آتا ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر پٹخنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب اور دیدار نصیب ہو بھی رہا تھا تو وہ بھی صرف چند گھڑیوں کے لئے۔ اور اس کے لئے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنا پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار اور محبت کا جذبہ ہماری رگوں سے سارا خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری روح کے کشکول میں کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پڑی۔ ''اوہ...... یہ بے چارے یہاں بھی آ پہنچے......؟'' ''تم جانتے ہو انہیں......؟'' ''کال گڑھ میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا۔ پچھلے چھ ماہ سے علاقے

کے ہر گھر کی چوکھٹ پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواسی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن ان دونوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو اُن کا کچھ نشان تو ملتا؟" جاتے جاتے سانول ایک بار پھر اپنا پورا منصوبہ دہرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے تھے۔ میں بھی آ کر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سکینہ کے نانا نانی کو تسلی دی کہ انشاءاللہ جلد ہی اُن کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رُخصت ہو کر جانے کے لئے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے گر گئی لیکن اُسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی۔ پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اُٹھا کر انہیں تھمانے کے لئے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار کپڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز بگولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹنا شروع کر دیئے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کپڑے کیا تھے، چند کترنیں ہی تھیں۔ تیز ہوا نے ایک زنانہ دوپٹے کو دور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اُس جانب بڑھا، جہاں مزار کے صحن میں اُگے کیکر کے ایک جھاڑ میں وہ دوپٹا اٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اُڑتے ذرّوں نے آس پاس سب ہی کچھ دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ یہ...... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اُس انجان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ ہاں وہی تو تھا...... لیکن یہ دوپٹا...... یہاں کیسے......؟ میں نے جلدی سے کیکر سے کپڑا علیحدہ کیا اور اسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبڑاہٹ دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا، "یہ کپڑے کس کے ہیں؟" اکرام صاحب نے جواب دینے کے بجائے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ ہماری سکینہ کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اُس نے اپنی بدنصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہے جی۔ کہتی ہے اس میں سے اُسے اپنی لاڈلی کی خوشبو آتی ہے۔" میرے ذہن میں بیک وقت جانے کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جو انجانی لڑکی رات کے اندھیرے میں مجھے اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سکینہ ہی تھی۔

……

لاحاصل کی کھوج

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر ان دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سکینہ کو دیکھا ہے لیکن نہ جانے وہ کون سا احساس تھا جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی کے کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چادر سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سکینہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی تو پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بنا پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے ٹوکا تو میں نے جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی۔ شاید جمعرات کی وجہ سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک پکی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جھجکتی سی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پلو نکالے اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری...... واقعی سانول کی تڑپ اور بے چینی بلا وجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی سادگی میں کس قدر کشش ہوتی ہے۔ کچھ سراپے خود سرتاپا ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کہنی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا کے ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سہیلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اس کے گھر چلی جائے۔ اس لئے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے کر بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں۔ جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ چھپا پاتے ہیں۔ نوری نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا رکھے تھے اور میں نے دور صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے سے پرے سانول کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زوردار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ”چھوٹے پیر جی...... آپ نے دعا کے لئے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔“ اُس کی اس ”چھوٹے پیر جی“ کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا

اور اس کے چہرے پر بیک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ”سعادت مندی“ کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُرسکون نظر آنے والی نوری کسی سمندر کے بے چین مدوجزر کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد نوری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب نوری کے ماں باپ کی زبان پر بھی چڑھ گیا تھا اور وہ رخصت ہوتے وقت تک مجھے ”چھوٹے پیر“ کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کال گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتقد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی منت صرف نوری کی اک نظر ہے۔ لیکن اس پیکر حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر بچھی ریت ہی کو نہارنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اُس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پژمردہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اُس کے حصے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لئے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔ اُس ایک نظر میں۔ حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک الوداع...... تب تک کے لئے جب قدرت ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گئی۔ لیکن مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح پیوست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اسی ایک نظر کی کسک اور تڑپ کے اثر میں گزر جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو یہ محبت ہر حال میں ایک دو دھاری تلوار ہی تو ثابت ہوتی ہے۔ نہ ملو تو جدائی کاٹتی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی راکھ کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز بگولے اور ریت کا طوفان اس راکھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک لمحے ہی میں کیسے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاکستر وجود کو لئے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی تو میں نے انہیں سکینہ کے دوپٹے والی ساری بات بتائی کہ اسی چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ”گویا وہ صرف ایک سراب ہی نہ تھی۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا وہ دے چکی۔ اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔“

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور ہمیشہ کی طرح چپ ہی رہا کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں جتنا میرے لئے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اور میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غراہٹ سنائی دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ”کالا“ بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار پر چار دیواری ہی کا رُخ کیا کرے گا کیوں کہ اس کے

پرانے مالک نے تو اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک "دیس نکالے" کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ وہیں اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ روٹی کے چند ٹکڑے نگلنے کے بعد کالا وہیں پیر پسار کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آ گئی تھی کہ وہ مزار کی چاردیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لے ہوا کے دوش پر بکھری۔ اُس کی تان میں جو درد آج تھا۔ اُسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید شیلے نے کہا تھا کہ "ہمارے سب سے میٹھے نغمے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔" آج سانول کی بانسری بھی شیلے کے اس قول کو سچ ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے ہونٹوں سے بانسری ہٹا لی۔ میں نے قریب جا کر اُسے چھیڑا۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک تمہاری دُھن کو اتنی زندگی بخش دے گی۔ ورنہ اس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر ٹھہرنے کی التجا ضرور کرتا۔" سانول پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں ہر لمحہ اُسے دیکھنے کے لئے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کبھی اُس کی ایک آدھ جھلک پا لیتا ہوں تو پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ......" "پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ میں عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر۔ پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔" اس مرتبہ سانول خود کو کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کانٹے ہوتے ہیں، گلاب نہیں۔

میں ابھی تک سکینہ کے بھید میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سکینہ ہی تھی۔ لیکن اس بار سانول کا ردِعمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی اُنگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیانہ انداز میں بولا "میری ایک بات مانو گے اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ یہ کھوج تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔" مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔ "کیوں......؟ ایسا کیا ہے اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ۔ کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔" سانول نے بات ٹالنے کی بہترین کوشش کی، لیکن میرے مصمم ارادے کے آگے اُسے ہار ماننا پڑی۔ "میں اس کے بارے کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل وہاں گئے بھی تھے۔" سانول بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا "تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے؟" سانول نے گہری سانس لی "پیرل کو اُس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ یہاں اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ "خدا کے لئے یہ پہیلیاں بجھوانا بند کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔" سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ "کبھی کبھی مجھے تم وہ نہیں لگتے جو تم ہو......لیکن پتا نہیں پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔"

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لئے موجود نہ ہو۔ پھر اس نے

دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود بیٹھا سنتا رہا۔ سانول کے مطابق وہ اور پیرل اُس رات گھر والوں سے چھپ کر قریبی قصبے میں نوٹنکی دیکھنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر انہیں دیر ہوگئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے تو بستی کی مشرقی سمت جہاں صحرا میں کچے گھر دور دور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی کچی چار دیواری کی آڑ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اس کا دوست ڈر کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ ہلچل ختم ہوئی تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لوٹے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا بڑھیا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سکینہ کی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر دستک دینا شروع کردی۔ اسی تلاشی میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک کھوجی ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی نواسی کے کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ”یہ کھوجی کیا ہوتا ہے......؟“ سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا تمہیں کھوجی کا نہیں پتا۔ یہ تو بڑے گنی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن اُن کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ ہوتا ہے جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حسیات تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بو پر کھوج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ زمین پر پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا، عورت کا ہے تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی۔ حتیٰ کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص کلیے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد عورت کی چال ڈھال اور رہن سہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہر حال یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمحے کے لئے سکینہ کو بھی بھلا بیٹھا۔ پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سکینہ کے نانا نانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لئے آن پہنچے۔ اُن کی گریہ وزاری سے کھوجی کا دل پسیج گیا اور اُس نے حامی بھرلی۔ اگلے دن طے یہ پایا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سکینہ اور اُس کے شوہر کے پیر کے نشان اُٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا۔ لیکن کھوج اور نشان اُٹھانے کے لئے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن چوں کہ صحرا کے بیچوں بیچ تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پل بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جمنے نہیں دیتی تھی اوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت۔ نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اس کا دوست پیرل اور سکینہ کے نانا نانی بھی کھوجی کے ہمراہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے بستی میں داخل ہو رہے تھے۔ سکینہ کی نانی بار بار سکینہ کی چادر کو چومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی اُن کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سکینہ کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن اس بار اُس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ

بھڑا ہوا تھا لیکن آدھی کچی چار دیواری کے پار آنگن کی ویرانی اور سناٹا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صحن سے پرے لکڑی کی بلیوں والے چھت کے برآمدے میں کھلنے والے اندر کے کمروں کے دروازے بھی ادھ کھلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد جھٹپٹا چھا رہا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر صحن میں داخل ہو گیا۔ لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا ”اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول۔ صحن کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی نشان باقی ہو۔“ سانول کے پیچھے کھوجی اور بیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں نے باہر روک دیا۔ سانول دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑا رہا۔ کھوجی نے اپنے کرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور اُن سے صحن کی کچی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ صحن میں اُترنے سے پہلے اُس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنا نشان والے اُونی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد صحن کی ریتلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہو گا۔ میں حیرت زدہ سا سانول سے فنگر پرنٹس اُٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام صحن اور پھر دونوں کچے کمروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سکینہ کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا۔ پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں کھرچا کہ ڈوری کے دونوں سرے کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگوٹھوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں اُبھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور صحن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ”کیا تمہاری نواسی بائیس سے چوبیس سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔“ بوڑھے سے پہلے بڑھیا چلا اُٹھی ”ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اُترتے وقت اُس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی، اس لئے وہ کچھ تکلیف میں تھی۔ لیکن تمہیں کیسے پتا؟“ کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ”اس صحن میں اور کمروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بائیس تئیس سالہ نوجوان لڑکی جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی، موجود تھی۔ لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہو سکتا ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہر حال ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے اب رات سر پر ہے۔ لہٰذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اُٹھانا شروع کریں گے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سکینہ کس طرف گئی ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزار دیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہٰذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ رات میں ویسے بھی کھوجی نشان نہیں اُٹھا پائے گا۔

ان کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے بیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اُس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے کیوں کہ کھوجی نے صحن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو کریدا کہ اسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی روح کو گھسیٹا گیا تھا وہ سکینہ ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چونکہ گھسٹتے وقت بھی لڑکی اپنے

داہنے پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پا رہی تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر جب وہ صحن میں گر پڑی تھی تو اس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش مکش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی اَن ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا۔ جو اس نے نانا نانی کو دکھائے بغیر ہی اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اُسے اگلی صبح کھل ہی جانا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ”پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....“ لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ”اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا موٹا سا تالا ہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینہ کے بدنصیب نانا نانی کھوجی کے بند در ہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا تو پیرل اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کروا دیئے کہ بڑے شہر میں اس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہٰذا اُسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینہ کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سرد رویے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہو گا۔ البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ و زاری سے تنگ آ کر وہ دو گھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اُس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھاننے کے بعد حتمی اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے آس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے لہٰذا اب یہاں سکینہ کی تلاش لاحاصل ہو گی۔ بہتر ہو گا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔“ سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اُسے خود بھی اس نا مکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔

”لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا۔ تم نے اس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔“ سانول نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”کھوجی نے اُس دن کے بعد سے اپنے لب کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لئے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لئے بھی ترس گیا ہوں۔“ ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں؟“ سانول میری بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ”اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو، عبداللہ۔“ ”میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے۔ چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔“

کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لالٹین تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ”اس وقت کون ہے بھئی.....“ دفعتاً اُس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ”تم.....؟؟“

❀.....❀

رُوح کا عکس

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی ہڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں......؟“ ”ہاں......اُس دن تمھیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ بستی کے بازار میں دیکھا تھا تم مزار کے نئے مجاور ہو نا......لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر......سب ٹھیک تو ہے نا؟“ اب سانول نے بات سنبھالی۔ ”ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ سو اسے یہاں لے آیا۔“ کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ”خدائی خدمت گاری“ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لیکن وہ چپ رہا اور بادل نخواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور سانول صحن میں پڑی جھلنگا سی چارپائی کی پائنتی پر ٹک گیا۔ باہر گلی میں اکا دُکا نمازیوں کے کھنکھارے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ”آپ سکینہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لالٹین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دانت پیس کر بولا۔ ”اچھا......تو یہ تمھاری شرارت ہے، بدمعاش لڑکے۔ اسی لئے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سائے سے دور بھجوا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے...... میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔“ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ”سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکینہ کو صحرا میں دیکھا ہے۔“

یہ دوسرا دھماکا تھا جو عین کھوجی کے سر پر بم کی طرح پھٹا۔ ”کیا......؟ تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ مگر کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم مجھ سے اس کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو۔ جا کر اُسی سے پوچھ لو نا۔“ میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا ”وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لئے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں، جس سے مجھے اُس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے۔ لیکن شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“ کھوجی غصے سے بپھر گیا۔ ”کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔“ کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعا پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو کھوجی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہے......آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اُوپر والے نے آپ کا اندر اس لئے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور اُن کی مدد کریں لیکن آج آپ نے اپنے فرض اور کام سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے

کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ختم نہ کر دے۔“ میں بات ختم کر کے واپسی کے لئے پلٹا تو کھوجی ہیجانی انداز میں چلایا۔ ”نہیں میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی...... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آ جاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ پر اُسے اگر کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا......“ سانول نے حیرت سے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اسی اُمید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جمی کچھ برف پگھلے۔ ہر فرض شناس کاریگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تلملا کر بول اُٹھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کمزور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بدنصیب اور لاچار بوڑھوں پر ترس نہیں آتا جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی جلتی ریت چھانتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آنگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ”تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ انگریز سرکار نے میرے باپ کو اس خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے پیشے کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن......“ کھوجی کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ پھر لمبی سی سانس لے کر بولا۔ ”اچھا غور سے سنو...... میں اگلی صبح اُس مکان کے باہر نشان اُٹھانے پہنچ گیا تھا۔ نشان اُٹھانے کا بہترین وقت صبح شبنم اور کہرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے تب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچے تھے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسیٹا گیا تھا اور پھر اُسے کسی اُونٹ پر لاد دیا گیا تھا۔ بس اس جگہ سے آگے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم بھی سمجھ ہی گئے ہو گے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے اس پردیس میں کیا کر لیتے۔ اسی لئے میں چپ رہا اور بس......“ میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اُس اُونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں گے۔ آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟“ کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ”وہ ایک نہیں تین اُونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”تو پھر آپ نے یہ بات سکینہ کے گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ کیسے بتاتا، اغوا کنندگان کو پچھلی شام ہی ہماری ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اُس مکان کے سامنے سکینہ کے نشان اُٹھا رہا تھا، تب ہی منہ اندھیرے وہ تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پہنچے۔ اُن کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خون آلود کپڑے تھے جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکھٹ پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اُسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اندر کا کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے آ گیا۔“

کھوجی اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ میں سانول کو اس کے گھر چھوڑتے

ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج۔ کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مزید اُلجھنیں سمیٹ لائے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات بھر تک کی تمام روداد انہیں سنا دی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سکینہ کا معاملہ کسی قبائلی رشتے داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر ایسی ان ہونیاں عام تھیں۔ لیکن اُسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے بہانے سے سکینہ کے نانی نانا کو کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اُن کے بقول سکینہ بہت پہلے ہی اپنے شوہر رحیم بخش سے منسوب تھی اور بنا کسی اُلجھن کے اُن کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید اُلجھتے جا رہے تھے اور ہر جانب سے میرا راستہ ایک بند گلی میں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد میں انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلتے گولے کو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول بڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اُسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ ”خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے......؟“ سانول نے سر پٹخا۔ یہ لوگ مجھے سکون سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتہ کے لئے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اُسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی تا کہ وہ سال بھر میں اپنی بیٹی رُخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میری بانسری کا ہر ساز تو اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر دھن اسی 'ایک' کے لئے۔ میں تو مر جاؤں گا اُس سے دور جا کر...... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھٹ جائے گی۔“ میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم اُدھیڑتے دیکھتا رہا۔ ال کیمسٹ میں پاؤلو نے غلط لکھا ہے کہ ”جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔“ اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو پوری کائنات ہمیں جُدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے۔ ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دو سانس لینے دیتی ہے۔ جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لئے آس پاس کی فضا میں جُدائی کا زہریلا دھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں۔ وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں میں نے اُس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرا میں کسی کا ریوڑ چرا کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔“ مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ”کالا“ بھی مزار کے باہر آ کر مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اُس کا زخم دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اُس نے پہلے دن محسوس کر لیا تھا۔ کہ میں اُس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد میں پھر اس ویران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کمروں میں بنی ایک گمنام قبر کے اُوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی

تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر میری طرف آگئے۔ ''کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو لگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔'' میں نے ان کی جانب براہ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ''آپ میرے لئے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کہیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' سلطان بابا مسکرا دیئے۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کسی کو خرد راس آئے تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو عبداللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فرزانگی؟ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔ ''بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ...... نہیں۔ بس اس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔'' سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید اس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لئے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا
وہ ایک مشت غبار ہوں
پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قطعے میں کیا بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بہت دیر کے لئے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص میرے لئے یہ سطریں کہی ہوں گی۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسے ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرا کی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی۔ لیکن آج اُس کی تان میں کچھ عجیب ہی کسک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز اور ہماری تانیں بھی اُسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لئے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم حبس زدہ رات مجھ پر کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھی کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سکینہ کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اُسے نظروں سے اُوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑے بیٹھا تھا جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ پھاڑ کر کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرے مقدر کی

طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید اُونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں...... یہ قافلے کی بجتی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اُونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرا میں قافلے صبح منہ اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ مسافر شب کو اُٹھتے ہیں...... جو جانا دور ہوتا ہے...... ’’لیکن یہ کیا...... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آچکی تھی اور مجھے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دُور دُور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن میں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا......؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر باریک تفصیل مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دُور کوئی بچہ رو رہا تھا۔ اُونٹوں کے کوہانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُونٹ خرخرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے ریت پر پڑنے والے پاؤں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پہرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نقارے پر چوٹ کی آواز تیز ہوگئی۔ ریت کا ایک طوفان سا اُٹھا اور میں اُسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بنتا گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چبھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔ جیسے لوگ مجھ سے بچ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں لیکن میری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دُور پھیلا ہوا ویران صحرا ہی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ یا خدا...... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر خود آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی کا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان تھم گیا تھا۔ لیکن میرے اندر اُٹھا طوفان کسی ریت کے جلتے بگولے کی طرح تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا......؟ میرے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا خرد سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ آخر کیا حد تھی میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو پانے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آنگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ زہرا کی رُوح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان ویرانیوں کی خاک کیوں چھان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ جانے کب سے تہجد کے لئے جاگے سلطان بابا مزار کے صحن میں نکلے اور مجھے یوں گم صم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں تب چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، اُن کے سامنے اُگل دیئے اور قافلے کا سارا احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے لیکن انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو اُن کا لہجہ تھما ہوا سا تھا۔ ’’میں جانتا ہوں تم کس دور سے گزر رہے ہو۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ راستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہارے لئے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہوگا۔ لیکن قصرِ سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمالے کی چوٹی پر

بسیرا کرنے کے لئے اپنی اُڑان بھی اُونچی رکھنی پڑتی ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے ابھی تمہیں ایسے مزید عذاب جھیلنے ہوں گے۔“ میں درد سے چلا اُٹھا۔ ”لیکن میں ہی کیوں......؟“ وہ مسکرائے۔ ”میں نے کہا نا...... کچھ چناؤ قدرت صرف اپنے ہاتھوں میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا۔ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ تو اب بھی تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحے یہ سب ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر نہیں۔ تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دور تک چلے آئے ہو۔ کئی ایسے بھی ہیں جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور چنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اُٹھا سکے اور روزمرہ کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چنتے ہوئے آج اس مقام تک آ پہنچے ہو۔ اتنا زادِ راہ بھی ایک زندگی کے لئے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رُخصت کرے گا۔“ میں نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ”آپ جانتے ہیں۔ واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خواہش ہے۔ لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع قدرت کئے بیٹھی ہے۔“ انہوں نے میرا کاندھا دبایا۔ ”اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔ اسے آزمانے والے پر چھوڑ دو۔“ میں نے تھک کر ہتھیار ڈال دیئے۔ ”لیکن یہ بھرے پرے قافلے کی صدائیں، یہ کیا ماجرا تھا......؟“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”صحرا کا اپنا فسوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو۔ جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی ہیں تو ایسے صحرا اور ویرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماجگاہ بنتی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی مادے سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو یعنی ایسے مادے سے بنی ہو کہ جس کے اندر سے روشنی بنا ٹکرائے گزر جائے تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن پائے گی ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانوں کی سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اگر اُن کی دنیا کی آوازیں سنی ہیں تو اس کا مطلب ہے خاص اس لمحے میں قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے اُن غیر مرئی صداؤں کو بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی اُن کی دنیا کی فریکوئنسی سے جدا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ کچھ خاص لوگ اس ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لئے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لئے شامل کر دے۔“

میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ ”اگر تصویر کا تعلق ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ سکینہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے۔ کیوں کہ میں نے اُس کی واضح تصویر دیکھی ہے۔ دھندلی لیکن واضح انسانی خدوخال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سکینہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے......؟“

”ہاں...... ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سکینہ ہو۔ لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے ساتھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں ریلوے اسٹیشن پر اُس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر اس سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا ہیولا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن اطمینان رکھو جلد یا بدیر تم اس ہیولے کی حقیقت تک پہنچ جاؤ گے۔ یاد

رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی لہر زندہ رہ سکتی ہے تو پھر ماضی کی تصویر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی جھلک ہو۔ اور قدرت نے ہی تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لئے یہ طاقت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی نا ممکن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں ''جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے......'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی مخصوص جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے کانپ رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کے مستقل دامن بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات بکھیر دیئے۔ میں گھبرا کر پلٹا۔ چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چونکے تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ مطلب یہ صرف میرا واہمہ نہیں تھا۔ آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین کرنے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اُسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اُس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ دُور سے میں نے اس اُونچے ٹیلے پر فجر کے جھٹپٹے میں کسی عورت کا ہیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف دیکھ کر چیخ رہی تھی اور اپنی مخصوص زبان میں کسی مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ ٹیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رُکنے لگی۔ یہ وہی ٹیلا تھا جہاں سانول گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

❖……❖

دشمن زندہ رہے

کچھ لمحے کے لئے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اس پکی عمر کی چرواھن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے سمجھ آ چکے تھے۔ ٹیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تھا اور اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے پیچھے ہی صحرا کی جانب لپکے تھے۔ جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ جب میں اور سلطان بابا اُسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اُس صحرائی گوالے کی نظر ہم پر پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جبروت کے قلعے میں دیکھ چکا تھا اور پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے فوراً ہی سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے اُنڈیل دیں، لیکن فی الحال سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگوں کا جمگھٹا چھٹا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور اُن کے پیچھے نوری کا باپ ہڑ بڑاتے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال ”کیا ہوا؟...... کیسے ہوا......؟ کس نے کیا......؟“ اور وہی ایک جواب کہ ”اللہ جانے......؟“ کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عورتوں اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی میں وہ سانول کے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو جلدی سے صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر کے جا چکا تھا اور اُسکے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نوری تھی اور نوری خود سراپا دعا بنی اُسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم آتے آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی۔ اس اثناء میں، میں اور سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سرہانے موجود تھا، جب اُس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھید کرتی ہوئی مقام قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اُس رات بھی حسب معمول اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اُس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولادی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی تکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں

سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہرحال اس وقت تو سانول کا ہوش میں آجانا ہی اُس کے پیاروں کے لئے غنیمت تھا۔ سانول کی دگرگوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اُسے فی الحال بستر سے اُٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لئے اُٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رُکنے کا اشارہ کیا۔ عیادت کے لئے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے تو اُس نے دھیرے سے پوچھا "وہ آئی تھی......؟" مجھے اُس کی حالت سے زیادہ اُس کے سوال پر ہنسی آگئی۔ "کہیں اُسے بلانے کے لئے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟" میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ "اُسے بلوانے کے لئے تو یہ سر کاندھوں سے اُتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔" پھر اُس نے صحرائی زبان میں ایک مصرعہ پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ "عاشق چاہے جیسا بھی درد اُٹھالے۔ کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھالے، دنیا والے اُس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے۔ تاکہ جب بھی محبوب سے ملاقات ہو تو وہ اس سے داد پا سکے۔" میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قطعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ...... صرف لفظ اور لہجہ ہی بدلتا ہے۔ باقی ہر کسک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ چبھن اور کسک کی وحدت۔ رُوح کو آری سے دو حصوں میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ قطرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف نام کیوں رکھ ڈالتے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام "محبت" کیوں نہیں رکھ دیتے؟

سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی بھٹک رہی ہے۔ اگرچہ مردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے اتنے قریب نہ آسکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اُس کی بے چین آنکھوں اور بے تاب رُوح کو سانول کے سرہانے ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی دیوار سے پرے اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سا میری بات سنتا رہا۔ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اُس کی حالت مزید ہیجانی سی ہوگئی۔ دیواروں سے پار جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن دیوار کا تو دوسرا نام ہی رُکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لئے، نئے جذبوں کے لئے......

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سکینہ کو اُٹھالے جانے والے چار نقاب پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سکینہ کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معمہ تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے "تمہارا دوست آیا تھا۔ میں نے اُسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اُسے تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔" وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے

''ہاں...... ایسا ممکن ہے...... سانول کو بھی اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔'' میں نے اس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا۔ ''کیا دشمنی بھی خالص اور ناخالص کے پیمانے پر تولی جاتی ہے۔ کیا دشمن بھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے......؟'' انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر پھونک ماری۔ ''سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے اتنی تو شاید یہ دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لئے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لئے جینے اور آگے بڑھنے کے تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔'' سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ''کون سا قول......؟'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور قول دہرایا ''دشمن زندہ رہے۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ برآمدے کے قریب رُک کر وہ میری جانب پلٹے۔ ''لیکن یاد رہے...... یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید کسی اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہٰذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔'' سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں ہمیشہ کی طرح اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت ور ترین انسانی جذبوں میں شمار کرتا تھا لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے، سلطان بابا۔ ''دشمن زندہ رہے۔'' جانے یہ قول دعا تھا یا بد دعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں ساری رات کالے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لئے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کسی اَن ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوجھی کہ خود ہی بول پڑے۔ ''چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کو ہو آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گا۔'' زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی۔ کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیڑ تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اُس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لئے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ''بڑے اور چھوٹے پیر صاحب'' کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے۔ اور بٹنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے آس پاس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی دھیرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی تو کال گڑھ میں پینے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا اور پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ داروں کی منت کر کے ان سے مزید کچھ قرض لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت جہاں پانی ملنے کی امید ہے وہاں

پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یک سر رد کر دیا۔ ایسی بارہا کوششیں پہلے ہی ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعی لاحاصل، صرف وقت کے زیاں ہی کا باعث ہوگی۔ اچانک کوئی کسی کونے سے بولا ''تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔ اب اور کوئی چارہ نہیں۔'' اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی کی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لئے دعا کی درخواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے ''اگر آپ سب کا یہی مشورہ ہے تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں ساری بستی کے مرد نمازِ استسقاء کے لئے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز ادا کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔'' سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور سے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ سے اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی۔ اس سے میں صرف اتنا ہی مطلب اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جمگھٹا اس کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے، لہٰذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اُٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد عصر کے وقت باہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو مکھیوں کی طرح جھنبھناتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا دعا میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہرحال عصر سے کچھ پہلے بستی کے مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لئے اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ مجھے اُسی دن راستے میں سلطان بابا نے بارش کے لئے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نمازِ استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی وہ واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت میں کی جاتی ہے۔ میرے لئے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان بابا سے کئی بار درخواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامع مسجد کے امام کا حق ہے۔ بالآخر امام صاحب ہی امامت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رُخصت ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اُٹھ گئی۔ سورج اب بھی اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی بدلی تو کیا کسی مٹی یا ریت کے بگولے کے آثار بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہاں حسبِ معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لاپروا ہو گئے تھے، جیسے خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا کی قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بددل ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اُسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے، تو پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسارے میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اُٹھ کر آسمان کو دیکھا۔ میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر آج بھی یقین اور بے چینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کو کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب جب مجھے پہلی جھپکی آئی تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر کے شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا۔ لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی تو پہلی نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے سارے بچے کاغذ اور پلاسٹک کی پتنگیں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اُڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ صحرا میں بادل، کتنا عجیب تضاد آمیز لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اُس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا اور آپ ایک اَن ہونی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔“ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں...... اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔“ سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح دُھل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی برستی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اُچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلترنگ بجنے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لئے تھی، لیکن میرے اندر کا ساون بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئے تھے کہ اُن کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر اُلٹ دی کہ ”میں نے اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب مل کر کھوجو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟“ یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اُسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لئے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت اور عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اِسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا جب میں اس سے ملنے اُس کے گھر پہنچا مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سرہانے بٹھا لیا۔ اُس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اُس کے باپ نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلایا ہوا تھا لیکن فی الحال اُس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اُس پر حملہ ہوا ہے بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اُس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی وہ سانول کی مزاج پرسی کے لئے اُس کے گھر آیا تھا۔ مطلب میرا شک ٹھیک تھا کہ اُن نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سکینہ کے اغوا سے بھی رہا ہو گا۔ سانول نے میرے خدشات دو چند کر دیئے تھے۔ لیکن میں اُسے اپنی پریشانی بتا کر مزید اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر اُس کے پاس بیٹھنے کے بعد اُٹھنے لگا تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اُس کے لئے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آنے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُسے

چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے.......... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل میں کتنا شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی اُلٹ پلٹ مچاتے ہیں ہمارے اندر کہ ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں۔ میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹتی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہٰذا میں کل پھر آؤں گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چاول بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا تو چند عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں سر جھکا کر سلام کر کے آگے بڑھنے لگا تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ''شالا چھوٹا پیر جیوے......'' کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی مٹی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں اور خدمت کی مٹی۔ مجھے مما یاد آ گئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرے عقب سے ایک سہمی اور ڈری سی نازک سی آواز اُبھری۔ ''چھوٹے پیر جی.......!!'' میں ٹھٹھک کر پلٹا اور حیرت زدہ برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے بھی علاقے کی ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوتا تھا اور میں اُس کے وجود کی لرزش اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔ باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں۔ اور اس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اس نے مجھے روک تو لیا تھا، پر خود اُس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُسے متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ ''وہ جی.......... چھوٹے پیر جی.......... آپ اس سے کہیں ناکہ شہر چلا جائے۔ یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔'' مجھے نوری کی تشویش کا اندازہ تھا۔

''آپ اطمینان رکھیں۔ میں سانول سے بات کروں گا۔'' میں بات ختم کر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی ہوا بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لئے یہ بھول گئی تھی، لیکن مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے گاڑھی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسا تھا، جس نے نوری کو آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصہ کے لئے یہاں سے دور چلا جائے۔ دشمن اگر اَن جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی کسی چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اُونچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ غراہٹ بھی رُک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی۔ لیکن کالا ہوتا تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی تھے کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں کے ٹولے میں سے تو نہیں تھے لیکن ان کے تیور بھی اس وقت کچھ ویسے ہی تھے۔ احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اُسی طرح اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے رقند بھرنے کے لئے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر میں ہی میرے سر سے لے کر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دورانیہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پاؤں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک ساکت ہی

کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جبڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنا لیا تھا اور باقی دو بھی اسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی بھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے.......... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے۔ ہم انسانوں کی طرح کسی کج بحثی یا تکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی۔ شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے۔ جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور پیام ہی کیا جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ بات تو تب ہے جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہمدم سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم ظرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلا طے کر کے جیسے ہی نیچے اترا تو میرے پاؤں جیسے ریت پر گڑ کر رہ گئے۔ مزار کے باہر جبروت کی جیپ کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا..........؟؟

* * *

دل سے دھواں اُٹھتا ہے

مجھے جبروت کی جیپ مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا میں اُسی کے زیرِ اثر تقریباً دوڑتے ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لمبے لمبے قدم اُٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہِ غلط ڈالتا ہوا جیپ میں سوار ہو گیا جہاں ڈرائیور سمیت ایک دوسرا محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گھما رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانس لیے اُن کے جانب بڑھا۔ “یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟” “دھمکانے آئے تھے......لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں......” میں مزید اُلجھ گیا۔ “پوری بات بتائیں......؟” سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے “جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اُس کا سکہ چلتا ہے، لہٰذا آئندہ کوئی بھی اجتماع کرنے سے پہلے اُس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔” میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان بابا کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ “تو آپ نے کیا جواب دیا؟” “وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزارہ ہی مانگ کر ہوتا ہے۔” گویا انہیں سانول کا مجھ سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طبلِ جنگ بج چکا ہے اور اب جلد یا بدیر ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ لیکن میری قسمت میں آرام کہاں......پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی جگ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے۔ کہتے ہیں پرانے زمانوں میں کاہن اور جادوگر ان تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تارا کھوجتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا۔ جو گردش میں سدا رہتے ہوں انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جگہ نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کوئی دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا۔ جلدی سے اُٹھ کر مزار کے منڈیر سے باہر جھانکا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا۔ کہ وہ اپنے لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دوبارہ گھر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں یوں اوازار نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُسے جبروت کے رات والے پیغام کی روداد سنائی جسے سن کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ “اوہ......یہ تو بہت فکر کی بات ہے۔ پھر بڑے پیر

صاحب نے انہیں کیا جواب دیا۔“ ”وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کال گڑھ آئے ہیں اُسے پورا کیے بنا وہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔“ سانول نے مجھ سے پھر وہی سوال کیا۔ ”لیکن ایسا کیا مقصد ہے اُن کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟“ میں نے لمبی سی سانس لی۔ ”یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں اُن سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اُن ہی کو دے رکھا ہے میں نے۔ لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لئے ہی تو کہتے ہیں کچھ عرصے کے لئے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اسی میں تمہارے اپنوں کی خوشی ہے۔“ سانول نے تنگ کر سر پٹخا۔ ”جانتے ہو میں پل کے لئے بھی اس سے دور نہیں جا سکتا۔ اس کے بنا تو میری بانسری سے بھی سر نہیں نکلتا۔“ ”اور اگر تمہاری دُھن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب..........؟“ سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتا دی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہو گیا۔ ”وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لئے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں وہ بھی زمانے کے ساتھ مل گئی ہے۔“ میں نے سانول کو ڈانٹا۔ ”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ تب ہی تمہاری فکر میں گُھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو۔ تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لئے یہ عارضی جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔“ سوچو وہ بھی تمہاری جُدائی میں اتنی ہی پریشان ہو گی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم ہی کچھ احساس کرو۔“ سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ”آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے شہر جانے کی ہامی بھر لی ہے۔“ سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سر ہو گیا ہے۔ اس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔ بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔“ سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول اور اس کا باپ بھی مسکرا دیئے۔ مزار سے نکلتے ہوئے سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ”لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا اور یہ ملاقات کل شام ہی ہو گی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلوا دو۔ باقی انتظام میں خود کر لوں گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے کل عصر کے بعد تیار رہنا میں تمہیں لینے آؤں گا۔

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کالے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میں روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دُور کالے کی پشت پر، میں نے اُس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے اُوپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اُس کے لئے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آ کر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر خود دور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اُتر آئے۔

اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا تو وہ پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر اُس کے ماں

باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے بستی سے باہر نکلتے ہوئے اُس سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟'' سانول زور سے ہنس پڑا ''نہیں! جو سودا میں نے تمہارے سات کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اس کی سہیلی کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں تو آج شام اُسے مجھ سے ملنے کے لئے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہوگا۔'' میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ''تو کیا وہ مان گئی۔ اُس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں.........؟'' سانول مسکرایا ''نہیں.........جواب تو کوئی نہیں آیا اس کی طرف سے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔'' میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ''تمہیں اتنا یقین کیسے ہے۔'' سانول اپنی ہی دُھن میں مگن تھا۔ ''ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی.........'' میں زور سے چونکا......... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا ''اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا اثر ہے تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھاتا چلا آتا ہے.........؟ اور پھر میں نے دور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڑھنی کو سانول کے کامل یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بظاہر ٹیلے پر اُگی ایک خاص جنگلی بوٹی چننے میں مشغول تھی، جیسے خود دنیا کی سب سے بڑی ''بہانے باز'' ہوتی ہے۔ میں مزار کے منڈیر کے قریب ہی رُک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اُس کی سہیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور ہنستی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈیر کا کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوا نے ریت کے چند شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ''کوکلا چھپا کی'' کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنساتا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریر بگولے نے کہا ''جانتے ہو وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں.........؟'' ''ہاں.........میں جانتا ہوں۔ سب ہی بچھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے۔ کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے.........'' سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دور بھیجنے کے جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر روئیں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرا کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اُسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ پل بھر کی ہی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند پل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سہیلی کے ساتھ ٹیلے سے اُتر کر بستی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم صم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اس آنسو کی چمک، میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں میں یہاں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع.........ایک اور عذاب جو سانول اور نوری کی جدائی کی صورت میں میری روح کو جھیلنا پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اُس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے قدموں کے نشان لگے تھے۔ میں نے اس کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اس کی روح تو نوری کی

آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چننے، ان سے وضو کرنے کے لئے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے غروب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ دائمی وصل کے لئے کبھی کبھی یہ عارضی جُدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ لیکن اگلی صبح میرے بے حد اصرار کے باوجود اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اُسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول اُس کے وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح سویرے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اُس کی گاڑی دوپہر کی تھی۔ میں خود اُسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ اُس کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو پڑا۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے "ارے.......... یہ کیا..........؟" "تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ۔ میں روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔" میں نے ماحول بدلنے کے لئے اُسے چھیڑا۔ "اچھا تو گویا خط میں بھی اُسی کی باتیں.......... میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لئے خط لکھا کرو گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟" سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ "اگر میرا خط اُس تک پہنچ پاتا تو یقین کرو میں اُسے ہر خط میں عبداللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کروا دیا کہ تم سے اسے میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتی ہے۔ میں ڈاک بابو کو بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔" میں نے سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر اُن کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔

سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میرے تنہائی اور وحشت دو چندی ہو گئی تھی۔ دل پھر سے ہوکنے لگا تھا۔

اُٹھتا دھواں سے دل گاہے ہے
ابھی رہتا ہے اس مکاں میں کوئی

اگلے روز سکینہ کے بوڑھے نانا نانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میرا کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب اُن کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا سکینہ کی اوڑھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اُسی کے اطمینان کی خاطر اُس سے کہا کہ وہ سکینہ کی پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے۔ وہ ضرور سکینہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سکینہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پوری کرے اور ٹھیک اُسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی "یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے ملا دے.........."

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اُس کے دوستوں کے لئے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آیا تھا تا کہ اُس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی غراہٹوں کی آوازیں بھی باہر سے بلند ہونے لگیں۔ لیکن خلاف معمول "کالا" مزار کے سامنے

آ کر بھونکنے لگا۔ اُس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تواتر سے آتی آواز نہ رُکی تو مجبوراً مجھے اُٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اُس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی تو میں چونک کر آگے بڑھا۔ وہ شاید کہیں سے یہ کپڑا اُٹھا لایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لئے بار بار بھونک کر باہر بلا رہا تھا۔ ارے یہ تو میرا ہی کُرتا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کے وجہ سے مزار کی الگنی سے اُڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا تھا، لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جبروت کے سب سے پالتو کتے انتہائی حد تک سدھائے ہوئے اور اپنی حسیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اوہ……… تو پھر ضرور کالے نے کُرتے میں میرے جسم کی باس پائی ہوگی، تب ہی وہ کُرتا یہاں اُٹھا لایا۔ کہتے ہیں کہ کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں میں اپنے مالک کے جسم کی بو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی جانب دوڑا۔ ایک مبہم سی اُمید نے میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر دی تھی۔ میرے کمرے میں ابھی تک سکینہ کی وہ اوڑھنی پڑی تھی، جو آج اس کی نانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سکینہ اُسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی ہے تو شاید کالا اُس کے دوپٹے میں بسی خوشبو کو پا کر اُس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اوڑھنی لے کر اسی رفتار سے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس پھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف گھوم کر اس کو سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں اس اوڑھنی والی کی تلاش ہے۔ کالا اوڑھنی سونگھ کر پھر سے میرے اردگرد چکر لگانے لگا۔ شاید اسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے چادر زمین سے اُٹھا کر اس کا ایک گولا سا بنایا اور اُسے دور صحرا میں اُچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب پہنچ کر بھاگنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر صحرا کی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش تیز ہو کر میری نسوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے ہوئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی اوڑھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اُس کے نقشِ قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رخ بستی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خوابِ خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی ویران گلیوں میں دھول اُڑا رہے تھے۔ کالا بنا رکے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا۔ اور قدم جواب دے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک اَن جانی قوت کے زیرِ اثر کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں کالے کے قدم ایک جگہ تھم سے گئے اور اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا میں بھی اپنی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ رہا تھا، وہ جبروت کے قلعے کی چار دیواری تھی۔ مطلب سکینہ دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی بڑھ جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھر کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھا دوں یا اس میں نقب لگا کر اس آہنی قلعے کے اندر گھس کر سکینہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے۔ بلکہ شاید ٹھیک اُس لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دونوں صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر کے اُٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سکینہ کی چادر دیکھ کر کچھ چونکے۔ ”کیوں میاں؟ کس کھوج میں

رہے رات بھر؟'' میں نے انہیں ساری روداد سنادی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی'' لگتا ہے کوئی بڑا امتحان سر پر ہے.......... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔'' انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سکینہ واقعی جبردت کے قلعے میں کہیں قید ہے تو اُسے نکالنے کے لئے پوری فوج درکار ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لئے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس سوچ میں خبر ہی نہیں ہوئی کہ جانے کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا، جب میرے ماتھے سے بہتا پسینہ ٹپ ٹپ مزار کے صحن میں بچھی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکنے پر میں تپتی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں بیٹھا لیکن ابھی شاید میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب نوری کے والد اور کسی دوسرے بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن سب کے چہرے ستے ہوئے تھے اور ماتھے پر پڑی شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ۔ لیکن آج اُن سب کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر بمشکل اُس کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا'' جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔'' میرے ہاتھ میں اکرام صاحب کو دینے کے لئے پکڑا پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر میں پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں بے ساختہ چلا اُٹھا۔ ''لیکن.......... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی ہے کہ نوری سانول کی منگیتر ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لئے شہر گیا ہے، پھر یہ سب کچھ.........'' میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر روہانسا ہو چکا تھا کہ اُس سے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سا سانس لے کر بولے۔'' کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی بول پڑھا کر شہر رُخصت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوری کو سانول کے گھر والوں نے اُس کے لئے مانگ رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی۔ ان کی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لئے رشتہ آ سکتا ہے۔ ہاں بستی والے تو اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے لیکن کسی کی نیت ہی اگر بُری ہو تو پھر اس کا کیا علاج..........؟''

میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔ ویسے بھی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں باپ کے اطمینان کے لئے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اُس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوئی اور نہ ہی کھلی بستی میں سے کسی دوسرے گھر نے جبردت کے مانگے ہوئے رشتے پر کمند ڈالنے کی ہمت کی تھی۔ اس لئے اگر کبھی جبروت کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی بیری کی طرف پتھر آتا تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا'' سانول کے باپ کا کیا کہنا ہے؟'' وہ بیچارا کیا کہے گا۔'' اُس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا ہوتا ہے، صرف بددعا اور کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے بیٹے کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ

سانول یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے۔ لہٰذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول تک کبھی نہ پہنچے۔ کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا اس کے کاندھے ہمیشہ کے لئے سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس چلتی لو کی سائیں سائیں اور ریت کے بگولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس ہمیں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے پاس سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا۔ وہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ”آپ لوگوں نے اب کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟“ ان تینوں بزرگوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔ ”کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا کرنے آئے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس طرح کے ظالم شخص کے قہر سے بچا لے۔“ سلطان بابا کی آواز بلند ہو گئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرت پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ”یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔ خدا بھی اُن کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔“ تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا۔ ”آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کی روحیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ بے بس کوئی اور نہ ہو۔“ سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے ”ٹھیک ہے……… اگر ساری بستی کی روح غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی سر انجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ……… مجھے جبروت کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔“ سلطان بابا نے پاؤں اپنی کھڑاؤں میں ڈالے اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

……

قفس اور جبر

اکرام صاحب نے جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میرے جانب دیکھا۔ جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف تعمیل تھا لہٰذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اُن کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رُک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ”میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں لہٰذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لئے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے لہٰذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لئے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا ظالم سے بھی بدتر ہے۔“ کچھ دیر کے لئے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اُڑتی چیلوں اور کال گڑھ کے نارنجی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سگے نہیں لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لئے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“ تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رُخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لئے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی۔ لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رُکتے دیکھا تو اُن سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جمتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول مجمعے کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیوہیکل چوبی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر یہیں راستے میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.........؟“ دربان کی جھاڑ سن کر مجمع میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا ایک شور گونجا اور سب ہی لوگ چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ”مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اُسے

اطلاع کرو کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔'' دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر اُبھرا۔ اُسے شاید اس لہجے اور اس بے باکی کی عادت نہیں تھی۔ ''مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اُسی سے ملتا ہے جس سے اُس کی مرضی ہو۔ ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپسی ہوگی۔ تم لوگوں کو اگر ملنا ہے تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا پھر آنا............'' دربان اپنی بات ختم کر کے نخوت سے منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دلچسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی لہٰذا لوگ بھی اِدھر اُدھر چھٹنے لگے۔ بہر حال ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اُسے یہ اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اُس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے۔ اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا۔ لہٰذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے والد سے رُخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ نمٹنے تک نوری کو لے کر کہیں روپوش ہو جائیں تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا۔ لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال کو رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طرح انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا اُتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد تنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید یہ اسی پھندے کی گھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سہمی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑانے پر مجبور کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اُسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جانب آتے دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اُسے وہم ہی سمجھتا رہا لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار کی دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم میں ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس وقت مزار کے صحن میں صرف میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لو کی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا، یہ بدنصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ اب تو اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار اپنی لاڈلی کی آخری فرمائش پوری کرنے چلا آیا ہے۔ نوری کی حالت میری سوچ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں رات بھر کے اشکوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی ''چھوٹے پیر جی...... آپ کسی طرح سانول کو اطلاع کروا دیں ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔'' گویا اُس نے مجھ سے وہی مانگ لیا جس کی توقع میں اُس سے کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مڑا تڑا سا کاغذ میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر خانے کا پتا درج تھا۔ لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے سے منسلک تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ کال گڑھ سے نکل پڑے۔ جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن سلطان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں

میں گم مزار کی دیوار سے پرے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اُسے پکارا تو وہ سٹ پٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی......؟“ میرا سوال سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی۔ کال گڑھ سے باہر پیر نکالنے کا مطلب ہمیشہ کے لئے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے۔ پھر میری سات نسلیں بھی یہاں دوبارہ بسنا چاہیں تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“

”سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی...... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی زندہ رہے گی تو......“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹخا اور پھر آدھے گھنٹے کے طویل وقفے کے بعد اُس نے نظر اُٹھائی تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا سب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے گا۔ نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اُونٹوں کے قافلے کی ہمراہی میں آج شام اُس کی بہن کے پاس کسی دوسری بستی روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہمراہ رات دس بجے سے پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ آؤں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے کر دوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچتے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لئے روانہ ہو جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کاشف اور پاپا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاطاً ایک الگ کاغذ پر لکھ کر دوں گا تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی اُن سے بات کر سکے۔ میں نے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اُسے ہمت دلائی اور انہیں رخصت کیا تاکہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“ کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی لیکن واپس پلٹنے سے پہلے وہ شکر گزاری کے بول بولنے کی کوشش میں روہانسی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارے احساس کو منتقل کرنے کے لئے کس قدر کم یاب ہوجاتے ہیں یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ہی ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین لغت بھی ان کے احاطے کے لئے ناکافی ہوجاتی ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر صرف اتنا ہی بولے۔ ”ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین اتنی ہی تنگ ہوگئی ہے تو پھر ان کا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو ضرور کرو۔“

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے بعد میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اپنا گھر بار چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔ شاید اس لیے مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگ ڈنڈی پر پہنچا تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھ گھنٹہ بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے کھٹک رہی تھی۔ اُجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی اپنی شناخت کو

دوسروں سے اُوجھل رکھنا ہو تو اُجالا کبھی کبھی کسی انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی میں اسی چاندکی چاندنی کے لئے مہینہ بھر انتظار کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں رات کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہلہ گلا کرنے اور محفل سجانے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر رومان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ پر ہی کوئی چھتری تان دوں تا کہ بستی چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب اپنے مقدر کے سورج پر تاننے کے لئے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو دور ٹیلے سے پرے نوری اور اُس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا دریا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اُس کے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگائے اور لمبا گھونگھٹ نکالے وہ اپنے باپ کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد رُک کر اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے تو نوری کا سانس بُری طرح پھول چکا تھا لیکن اپنے باپ کے خوف سے اپنی اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور ابھی گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لئے ان دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ......

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکز کی بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بُری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار تب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے بام کو۔ اچانک ہی صحرا میں جیپ کے زوردار انجن کی فراٹے بھرتی آوازیں گونجی کہ ہم تینوں ہی اُچھل کر رہ گئے۔ جیپ کسی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدے قہقہے اُبھرے اور جیپ میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی...... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔“ وہ سب لوگ پھر سے ہنسے اور ایک ہیولا جیپ سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا۔ جبردت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، مجھ سے زیادہ ہوش و حواس میں ثابت ہوا۔ جبردت نے پہلے ہی نوری کے گرد پہرا بٹھا رکھا تھا اور اُسے شاید مزار سے شروع ہوئی اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا کہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اُسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھر پور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ”کیوں پیر جی، تم اسے بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ہی ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔“ وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک

کر جیپ میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے نوری اور اس کے باپ کے چہرے پیلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بُری تھی۔ مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظورِ نظر نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے مزید بدتمیزی کرتے لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکیں البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیپ قلعے میں داخل ہوئی تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ سی راہداری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند شہتیروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمروں کی قطاریں۔ پھر اُوپر منزل میں روشنی ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیمپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اُوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ”لے آئے ہو انہیں۔ بند کر دو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔“ اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اُوپر سے بوڑھا چلایا۔ ”لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔“ نوری چلائی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لئے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی۔ لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اُس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہو گی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے سچ کہ تقدیر ہماری تدبیروں سے ایک چال ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے تہ خانہ نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں لگی لوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں اُفقی رُخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرح ہماری ناشکری پر ہم سے رُوٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اس جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلائیاں سی جلتی ہوئی نظر آئی۔ میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سرد سی لہر جھنجھوڑ گئی۔ یہ کسی جہازی سائز کے چوہے کی دو آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی

اور چوہا اُن میں سرفہرست تھے۔ کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی وہیں اس چوہے کا گھر یا راستہ تھا، لیکن اب میری مجبوری یہ تھی کہ اپنے بند ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے ٹیکے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے۔ لہٰذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا جب ''جبر'' کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں۔ نہ صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے۔ ہماری روح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لئے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے، روح کی وہ بندش کسی عالیشان محل میں کمخواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں اُلٹنے لگی تھیں۔ اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھونکنی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی سب ہی کچھ میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی جسم کو مس کرتی ہوئی موجودگی میں ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ اسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جمے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی تو دوسرا بھی ردِعمل ظاہر کرے گا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ روسو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر اَن دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے اُن اَن دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند ڈوبا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بیتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک اُبھری ہوئی اینٹ کی اُوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ''شکریہ دوست تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانسیں مزید لکھی ہیں تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا.....'' وہ دونوں غلام مجھے دھکیلتے ہوئے اُسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندر سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور سب ہی لوگ اُسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے جیسے ریچھ کے تماشے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہر سی تھی۔ البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے

تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اُٹھا اور لوگوں کے بیچ ایک رستہ سا بنتا گیا۔ مجھ میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل الٹنے لگا۔ اکرم اور دو نئے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رُعب دار آواز میں سارے ہجوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسری جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو...... ”کیسے ہو عبداللہ میاں؟“ میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر زیرِ لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے اُن کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بھیگی پلکوں کو اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا......

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر احاطے میں بچھے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور قہر بھری نظر میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ میری نظر اُس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اُس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

……

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اچانک وہ زور سے دھاڑا ''تو تم ہو عبداللہ...... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ ویسے ایک بات ہے تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگا لے جانے کی کوشش کرنے والا یا کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر...... لڑکی کی رضامندی بھی شامل تھی، تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اُسے ورغلایا تھا......؟'' مجمعے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ''میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔'' میری بات سنتے ہی جبروت کے منہ سے غصے کے مارے کف بہنے لگا۔ اُسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے چلایا ''سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھیس میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لئے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو...... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں۔ ضرور اس کا باپ بھی تمہارے بہکاوے میں آ گیا ہوگا۔ بہر حال لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو......'' اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی ''کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے۔ تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف......'' جبروت چونک کر پلٹا۔ یہ آج کی دوسری انہونی تھی کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا ''وہ...... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ...... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے۔ پھر نہ کہنا کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔'' جبروت نے دادِ طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت ہجوم کی خاموشی سے چڑ سا گیا۔ اُسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بنتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں عبرت کی مثال نہ بناتا تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کمزور اور بے بس بوڑھے کے ہاتھوں لگتی۔ لہٰذا اُسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ''لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں اپنی صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکے تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔ تو بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو......'' سارے مجمع کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہو گئی۔ یہ اُن سب کے لئے بھی ایک انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر

زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگاتار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے ”عبداللہ کی صفائی کے لئے لڑکی اور اُس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا چاہتی اور اپنے باپ کے ساتھ شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی کا حق ہے۔ اسے شہر جانے دو۔“ جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا...... بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی سست اور گواہ چست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اُس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو تو وہ بھی بیان کر دو۔ کوشش کروں گا تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔“ کارندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اُسے داد دی۔ سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”ہاں...... ایک خواہش اور ہے میری، اگر پوری کر سکو تو۔ مجھے اس بزرگ جوڑے کی نواسی سکینہ کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید در بدر اور خوار نہ کرو۔“ جبروت ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہو گیا اور اُس نے اپنی قہر بھری نگاہ سلطان بابا کی اُٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں ہجوم کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اُٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان سے نکل کر اُن کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں اطراف اس طرح ہٹے جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ دے۔ لوگوں کی آخری قطار میں سکینہ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے یا پھر جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا تو وہ بھی اُسی وقت اُن کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل بھر ہی میں ہوا ہو گئی اور شدید طیش کے عالم میں چلایا۔ ”بس! بہت سن لی تمہاری بکواس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اَن داتا کون ہے۔“

”نہیں یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا اَن داتا صرف ایک ہی ہے۔“ سلطان بابا نے آسمان کی جانب اُنگلی اُٹھائی۔ ”اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو۔ سچی توبہ کر لو۔ اس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہاری سانس چل رہی ہے لہٰذا توبہ کا وقت ابھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اُٹھا لو۔“ جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لبریز ہو چکا تھا۔ آج تک کسی نے اُس کے سامنے یوں سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اُسے ہماری آنکھوں سے اپنا خوف مفقود دکھائی دے رہا تھا جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ”خوف“ تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور عجیب سا انکشاف ہوا۔ ”خوف“ کا واسطہ دراصل ”پوشیدگی“ سے ہوتا ہے۔ جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھو دیتی ہے۔ اور شاید ٹھیک اُسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کونے میں بھی سر اُٹھا رہا تھا۔ اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث اُس کا خوف، اُس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔“ افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکے۔ لہٰذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو ورغلا کر بھگا لے جانے کا مجرم سمجھتی ہے۔ لیکن اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلتے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہو گا۔ دوسری صورت میں یہاں موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے...... “ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور حلق تر کر کے بولا

‘‘میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پر اتنی کڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے......’’ جبروت کے ماتھے پر شکنیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی، اور اُس کے والد اور دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیئے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کروا دیا۔ ‘‘ٹھیک ہے کل کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل کرے تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔’’ سارے ہجوم کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی قطاروں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں آنکھوں میں التجا بھی کی کہ میں جبروت سے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ‘‘اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے سکتا ہے تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے۔’’ بزرگوں نے سر پیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام گردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ البتہ دوسری راہ داری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے وہ کسی اور جانب لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھڑیوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کمرا بھی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن دان بھی نہیں تھا۔ البتہ اُوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھ اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھڑی کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزرنے کے لئے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی سلاخوں والا نہیں تھا لہٰذا سخت لکڑی کا بھدا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھڑی میں آدھی رات جیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ‘‘یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔’’ تو کیا میرے اس فانی جسم سے رُخصتی کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیئے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا اچانک دیوار کے اُوپر والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سنائی دی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا۔ ‘‘کوئی ہے؟’’ تو میں چونک کر کھڑا ہو گیا ‘‘میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو......؟’’ دوسری جانب سے آواز آئی ‘‘شش...... آہستہ بولو۔ جبروت کے کسی کتے نے اگر تمہاری آواز سن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قید تنہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھڑی بدل دے۔ ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے کو، کسی سے بات کرنے کے لئے۔’’ مجھے حیرت ہوئی ‘‘لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے......؟’’ میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لا پھینکوایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے اسی کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سانسیں ہار چکے ہیں۔’’ اچانک دُور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا ‘‘کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔’’ وہ جو کوئی بھی تھا، دیوار سے دُور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا شوربا ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نیچے، درز سے

اندر کھسکا دیا۔ اور زور سے ہنسا ’’کھانا کھا لو جوان! کل تمہیں صحرا بھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔‘‘ پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی ’’لے بھائی خانو، تو بھی عیش کر۔ پھر نہ کہنا یاور یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔‘‘ جواب میں خانو نے شاید یاور نامی بندے کو کوئی گالی دی۔ آواز مبہم تھی، لیکن یاور کے قہقہے مجھے راہداری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو کچھ اُجالے ہمارے اندر اُتر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو۔ سو میں بھی باہر کی تاریکی سے منہ پھیر کر بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اُجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز اُبھری۔ ’’عبداللہ تم جاگ رہے ہو......؟‘‘ مجھے اُس کا سوال سن کر ہنسی آ گئی۔ ’’تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس آرام دہ کمرے کی مسہری پر ٹیک لگائے اپنے غلاموں کا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہوں؟‘‘ دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ اُبھری ہو گی۔ تب ہی وہ بولا ’’زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آ پھنسے؟‘‘ میں نے مختصراً اپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے زہر خند لہجے میں بولا ’’تم ٹھیک سمجھے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔ وہ لڑکی اب کبھی بھی اس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس درندے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے انجانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں۔ اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آہ نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔‘‘ خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی۔ ’’سنو خانو! کیا تم سکینہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسی بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا......؟‘‘ میری بات سنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لئے سناٹا سا چھا گیا اور پھر خانو کی ہیجانی سی آواز سنائی دی۔ ’’تم سکینہ کو کیسے جانتے ہو...... خدا کے لئے بتاؤ پچھلے مہینوں سے مجھے اُس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لئے آنکھ لگتی ہے وہ میرے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اُس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ تمہارا اُس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔‘‘ خانو کا ہیجان اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوتی آواز آس پاس کے پہرے داروں ہی کو ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا تو اُس نے دھیرے دھیرے سکینہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنا شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لئے ٹھہری تھی۔ شاید انجن فیل ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے گھبرا کر لوگ پلیٹ فارم پر اُتر آئے۔ انہی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہو گا۔ کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی اور

سہاگ کا سرخ جوڑا ابھی تن پر موجود تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اچھا "شکار" ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اُس دن خانو بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ اسی اثناء میں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا رہی تھی اور لڑکا پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ ٹرین کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلیٹ فارم پر گاڑی کے تین گھنٹے کے اس غیر متوقع سٹاپ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اُس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور حبس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور پھر جم کر ہی رہ گئی۔ اُس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اُس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین کے عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جنکشن سے دوسرا انجن منگوایا گیا ہے لیکن کال گڑھ پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ چھ گھنٹے لے گا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شوہر بھی ناکام و نامراد بنا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً اٹھے اور مودبانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اُن کے ساتھ بستی تک چل کر پانی اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ اکرم نے فوراً پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے تو اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم بخش اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لئے پانی اور کچھ پھل وغیرہ لے کر واپس آ جائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لئے راضی ہو ہی گیا اور اپنی بیوی کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سکینہ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر بے تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب بھلا آدمی دکھائی دیا۔ ویسے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لئے اس دیہاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسنا قطعی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لئے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے نکلتے ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لئے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سکینہ کو لیے سیدھا کال گڑھ کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے "کارنامے" کی اطلاع دینے چلا گیا۔ سکینہ اور رحیم بخش کے لئے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لئے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ جلدی تھی۔ اُس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے لہٰذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے لیکن خادمہ نے اُسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لئے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب تک آئے گا، تب تک اُسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران سکینہ کی پھولوں والی اوڑھنی کی بہت تعریف کی۔ سکینہ نے اُسے بتایا کہ یہ چادر اُس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھاپے میں بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سکینہ کی شادی کے لئے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سکینہ جب کبھی یہاں سے دوبارہ گزرے اُس کے لئے بھی ایسی چادر ضرور بنواتی لائے۔ سکینہ نے بھی وعدہ کر لیا۔ اُن ہی خوش گپیوں میں رحیم بخش اور سکینہ نے کھانا کھا لیا اور خادمہ برتن لے کر

واپس چلی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش کی آنکھ کھلی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اُس کا منتظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ جو رات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اُس سے پوچھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور سکینہ کہاں ہے......؟" خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم بخش نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ گیا کہ وہ تو خود اپنی سکینہ کو تلاش کر رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعہ دار کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ اُس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اُس پر خادمہ کے کمرے میں زبردستی نشے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحرا پار کرنے کی سزا دی گئی۔ البتہ اُس وقت جبروت کا دربار عام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اُس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سکینہ کو اُس رات بستی کی بیرونی سمت ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اُسے خانو اور اکرم اُٹھا لائے تھے۔ آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحرا پار نہیں کر سکا۔ سکینہ اُس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی گئی، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اُسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے اسے بھی جبروت کے قاتل پنجوں کے دباؤ کا شاخسانہ قرار دیا۔ بہر حال سکینہ مر گئی...... خانو چپ ہو کر ہانپنے لگ گیا اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سکینہ ہی نہیں مری، کال گڑھ کے ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو زور زور سے رو رہا تھا۔ "جس دن سے سکینہ مری ہے، میں ایک لحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے وہ ہر پل میرے آس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ابھی تو شادی کا پراندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تتلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں کے پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کئی خواہشیں باقی تھیں۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔" خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے لگا۔ جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اُس کی شبیہ اُس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی لہروں کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہ میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی موت کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحرا مجھے بھی کوئی سچا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ کہہ سکا۔ پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ "سنو عبداللہ...... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا اور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دور نہیں لیکن جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا میں تمہارا مقابلہ ہو گا وہ اس سے پہلے نہ جانے کتنے معصوموں کا لہو پی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو تو تم اس صحرا اور جبروت کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بظاہر اس سے یہی تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں

دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جان بخشی ہو جائے گی۔ یہ درست نہیں۔ اوّل تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی ناکام بنا دیتا ہے۔ لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے تو وہاں اُسے اکرم اپنا انتظار کرتا ہوا ملے گا۔ لہٰذا پندرہ منٹ تک لگاتار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا۔ کتے تمہاری بو پر اُسی جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ اُن کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالکل نیا ہوگا۔ وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے۔ اگر تم سڑک تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے۔ کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے سے یا تو تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا......‘‘میں نے حیرت سے دہرایا’’کیکڑا......؟‘‘’’ہاں صحرا میں مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیت کی گاڑی چلتی ہے، اسے لوگ یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی کی جائے پناہ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھنا...... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پچھلے دنوں یہاں بارش ہوئی تھی۔ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جوہڑ مل جائے لیکن ہوشیار رہنا دو گھونٹ سے زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ تر کر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاس میں پانی بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا۔ اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا کہ صحرا میں دوڑتے وقت سانس منہ کی بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جوتے اُتار کر نیفے میں اُڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے لیکن تلوؤں کی جلد پوری طرح جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رومال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر سر پر باندھ لینا۔ اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ دوڑتے ہوئے ہی جیتنی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا مانگتا ہوں کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے......‘‘خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سکینہ کے بوڑھے نانا نانی کا دھیان ستا رہا تھا۔ اچھا ہی ہے کہ میں دوبارہ اُن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں ورنہ میں انہیں کیسے بتا پاتا کہ اُن کی لاڈلی سکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا’’کیا تمہیں سکینہ کی قبر کا کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ اُس کے ورثاء کو اور کچھ نہیں تو اُس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے تو شاید اُن بدنصیبوں کو کچھ قرار مل سکے......‘‘خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا’’یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوئے ہیں جنہیں باقاعدہ کوئی قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا تھا‘‘’’کیا......؟‘‘لفظ تھے کہ انگارے...... میری سانسیں رُکنے لگیں۔’’اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں۔ یہ بہت ضروری ہے خانو......‘‘خانو نے اپنا سر پیٹا’’ارے ہاں...... یہی تو جگہ تھی۔ اسی برآمدے میں دائیں جانب سے ساتویں کوٹھڑی تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھڑی ہی میں اُسے دفنایا تھا ہم نے۔‘‘خانو کی بات سنتے ہی میں چکرا کر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رُک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اوندھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر دائیں طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سکینہ اسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

اک نئی جنگ

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری ممکن حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اُس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ نہیں گئے۔ میں اُس مظلوم لڑکی کے لئے اور کچھ نہ کر پایا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اُس کے مدفن پر اپنے پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آہٹیں بلند ہوئیں تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ”میں جا رہا ہوں دوست۔ اگر تم یہاں سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کنارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔“ میری بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے۔ خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی وہ ”رب راکھا“ تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں بٹھا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں موجود تھے۔ جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا کو بھی وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اُس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑھے، پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تسبیح ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ”جب تک ہماری ایک بھی سانس باقی ہے، موت زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے۔ یہ دنیا صرف ابتدا ہے انتہا کا سفر اس جسم سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے بڑھ کر گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زادِ راہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آنکھوں کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ”جیتے رہو۔“ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس دعا کی اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں اپنے لاڈلے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اُٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اس کی جیپ شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریحِ طبع کے لئے کھیلتا ہے۔ پھر چاہے وہ رحیم اور سکینہ کا معاملہ ہو یا نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی حجت کے بھی۔ مجھے اور رحیم کو وہیں صحرا میں ختم کروا سکتا تھا۔ بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُسے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا تو ضرور اس کے پیچھے بھی اُس کا اثر و رسوخ شامل ہوگا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانون چلتا تھا۔ جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں یا نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویے کا نام ہے، جو ذہنوں کو مسخر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ روحوں کا تو پتا نہیں، پر جسموں کو تسخیر کرنے کے لئے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے

لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزا آتا تھا۔ یہ سارا تماشا اُس نے اپنے جنوں کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا دوست، کاشف لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے گئے تھے تو ہمیں پکاڈلی کے علاقے میں ایک عجیب کلب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے دیکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنالین رش(Adernaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود ایک مادے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے۔ مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تعیش اور تجربے سے گزر چکے ہوتے ہیں، اُن کے لئے زندگی ایک بے کیف سا معمول بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں کچھ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لئے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالور کے ایک چیمبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے سفوف کو اپنے نتھنوں کے ذریعے اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لئے کسی اور جہاں کے باسی بن جاتے ہیں۔ لیکن اس ایڈرنالین رش (Adernaline Rush) کا یہ جان لیوا نشہ باقی تمام نشوں کا سرتاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں دھکیل کر اس قضا کو پل پل رگوں میں اُترتا ہوا محسوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت بھی ایسے ہی کسی نشے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اُسے ریچھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اُڑتے دیکھ کر ہیجانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی وہ اُس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اُس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی تکا بوٹی کر کے اُس کے خون آلود کپڑے اپنے جبڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف ہیجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک دی رپر (Jack The Ripper)۔ کبھی فرینکنسٹائن (Farnakinstine)اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اُتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی شخص بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے ہوں گے۔ کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہر تو میں اپنے سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ’’ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لئے۔ اب بھی وقت ہے اگر تم اپنے جرم کا اقرار کر لو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جا سکتی ہے، مولوی جی......‘‘ جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تضحیک تھی۔ میں نے چند لمحے اُس کی جانب غور سے دیکھا۔ ’’اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی تو تمہارا یہ کھیل ادھورا رہ جائے گا۔ پھر شاید میں نہیں تو کوئی اور اس جنوں کی بھینٹ چڑھ جائے کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے کیوں کہ صرف اسی صورت تمہارے اندر بھڑکتی یہ لہو کی پیاس شاید کچھ دنوں کے لئے بجھ جائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے بعد شہر کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔‘‘ وہ کچھ دیر میری جانب عجیب سے انداز میں دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ’’یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر ہر خوف خود تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روتے گڑگڑاتے اور پیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے۔ لہٰذا میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لئے ایک باوقار موت چنی ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال

گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔” جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی اور صحرا میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں غراتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جبڑوں سے رال ٹپکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزارا گیا تا کہ وہ میرے جسم کی بُو کو اپنے دماغ کے خلیوں میں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے، اپنا جسم اُن کے جبڑوں سے مس کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید میرے اندر بھی اُسی ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لئے جبروت تپتی دھوپ میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اُس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرے متوقع خون بہنے کی وجہ سے تھی جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اُس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا “اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول دیئے جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے۔ بس شرط صرف اتنی سی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں اور ہاں بے فکر رہو یہ سدھائے ہوئے ہیں لہٰذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہیں دور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟” میں نے سر ہلا کر “ہاں” کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔ پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جوتے اُتارے، ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں ننھے منے انگارے میرے تلووں سے ہوتے ہوئے، خون کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے تلووں کو یکے بعد دیگرے اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ میں یہ سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ “یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔” میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اُس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیئے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چٹخنے لگے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے، حلق میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تا کہ حلق میں لگی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے لیکن پہلے ہی سانس میں اُڑتی ریت کے بگولے سے ہزاروں ذرے کسی خاردار تار کی طرح میرے گلے سے ہوتے ہوئے سانس کی نالی میں اٹک گئے اور مجھے زوردار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے ٹکرائی “منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔” میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پانچواں ٹیلا پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے تلووں میں پہلے منٹ میں جوتے اُتارتے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھالا پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کھلے زخموں کے ساتھ نمک کے سمندر پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کھلے منہ والے زخموں سے، خون میں مل کر اسے جلا رہا ہو، اس تُرش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر اُس جانب لپکا۔

میرے اندر بیٹھا خانو چلایا ''براہ راست سورج کو نہ دیکھنا......'' لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظر اس قہر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں اسی سورج کی جھلستی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے جا گرا۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لئے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک دُور کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری حسیں جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیئے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے رہی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں ٹیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں ٹیلے سے دائیں یا بائیں......؟ شاید دائیں......؟ نہیں نہیں بائیں جانب، لیکن......شاید دائیں......؟ میں سرپٹ دوڑ تو رہا تھا لیکن میرا ذہن جیسے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلا ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک چھوٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اُوپر چڑھا میرے ذہن نے میکانیکی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب......اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مُڑ گیا۔ شدید پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ بس ایک بوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پھر چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آ جائے۔ اچانک میری نظر دور صحرا میں چمکتے ایک سکے پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں میں جگمگا رہا تھا لیکن یہ طلائی سکہ یہاں......؟ اور پھر وہ جگمگاتا سکہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے...... یہ تو لوہے کی ایک بڑی سی پرات تھی۔ نہیں۔ اوہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جوہڑ، جو ایک بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رُخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہ راست وہاں نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرش بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت قریب آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سمیٹنا شروع کر دی تھیں۔ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جوہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا سر اس گدلے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جوہڑ کیا، میں پورا دریا بھی ایک ہی گھونٹ میں پی جانا چاہتا تھا۔ ''خبردار......گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔'' میں نے سر جھٹکا ''نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی کر ہی مر جاؤں۔'' اُس وقت مجھے ادراک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسوں میں بہتا خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چوس چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کنپٹی پر پھڑکتی میری نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور خانو پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا۔ ''نہیں عبداللہ نہیں۔ یہ پانی نہیں موت ہے۔'' دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی موٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور میری آنکھیں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کٹورے میں ابھی تک جوہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جونک میری ہتھیلی کی جلد میں ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جونک تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی لیکن ہتھیلی والی سرمئی جونک، میرے

سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی ہی رہی۔ درد، جلن اور چبھن کی ایک کٹیلی لہر میری اُنگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا ہاتھ نیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم جلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جونک کی نازک اور لجلجی سی چپکیلی جلد سے شدید تپتی ریت ٹکرائی تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر کوئی پانی کا چھینٹا مار دے۔ جونک تڑپ کر اُچھلی اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے رومال نکال کر پانی میں بھگویا اور اسے اپنے خشک چٹختے ہونٹوں سے لگا لیا۔ میرے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسر آئی تو ان کی حالت مزید خراب ہوگئی اور خون کی پتلی سی چند لکیریں رومال کی سطح پر اُبھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بھیگا رومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اُسے بھگو کر اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہاں...... یہ وہی بھونکتے کتوں کے دوڑنے اور غرانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے۔ میں اُٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ گئے تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم لو کا رخ بھی اسی سمت تھا، جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ لہٰذا اُن تک میرے جسم کی بو پہنچتے پہنچتے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن اب خود میری اپنی روح دھیرے دھیرے میرے اندر سے سرکنا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان بابا کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے روزانہ کئی بار طے نہ کیے ہوتے تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا۔ کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس کے بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکواش کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ”دوڑ“ کا اصل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے ریت کے بگولوں کے عقب سے اس پہلے عفریت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا اشک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے میری بو پالی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے لیکن اس کی غراہٹیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میری اُلجھی سانسیں خود ایک غراہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر بھی تو ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ ان آخری لمحات میں میرے اندر کا درندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں عبداللہ یا ساحر نہیں...... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لئے ایک خونی عفریت کا سامنا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کی تمام جبلتیں ایک دم ہی میرے اندر انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب دوڑتے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھی، جسے میں اپنے دفاع کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ غراہٹیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھپ دھپ کی آوازیں میرے حواس معطل کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی طرح بنا بھونکے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دبی ایک خشک ٹہنی نما لکڑی پر میری نظر پڑی اور میں اسے اُٹھانے کے لئے جھکا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ چھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی لیکن اس اثنا میں پہلا دشمن میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوتی تھیں۔ اُس نے دوڑتے ہوئے بنا رکے مجھ پر زقند بھری اور ٹھیک اُسی لمحے وہ لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشیانہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کیسے کہ وہ چھڑی کتنی زور سے لگی کہ اُس کے منہ

سے ایک سسکی کی آواز نکلی۔ میں ایک جانب اور وہ دوسری جانب جا گرا۔ لیکن اُس نے پلٹ کر جھپٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی لہٰذا اب مجھے اپنے شکستہ بازوؤں ہی پر بھروسا کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خونی پنجے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں مرچیں بھر گئیں۔ اس کی غراہٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوتھنی سے بہتی رال کا دھارا عین میری بائیں آنکھ کے اُوپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبڑوں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکیلے دانت عین میری شہ رگ میں گڑ جانے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لئے میری اور اُس کی نظر ملی، وہ جھنجلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت تڑپو...... اپنی جان مجھے سونپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا......“ میرے اندر کا درندہ غرایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں......“ اچانک ہی مجھے اس بے بس ریچھ کے پینترے یاد آ گئے۔ وہ ریچھ اس طرح کے کئی عفریتوں سے ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی کے دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے نرخرے کو ان کتوں کے جبڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب ان سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہ رگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اس وقت میرے سینے پر بیٹھا میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ اس کی مستقل غراہٹ اور سانس کی خرخراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ صفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لئے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید یہی اثر سانپ کی پھنکار اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک اس کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کامیابی عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو شل ہو رہے تھے اور اس کے پنجے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑے جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اس کی قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُوپر سے اُچھال کر دور پھینک دیا۔ میرا کرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اُسے جسم سے علیحدہ کیا اور بچے کھچے کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس کر باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہ رگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ تب تک میرا دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی اثنا میں پچھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گروہ کے دو، اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے وحشیانہ آوازیں بلند کیں۔ میرے آخری لمحے شروع ہو چکے تھے۔ میری پوری کوشش کے باوجود میری رفتار مدھم پڑ چکی تھی اور قدم ریت میں دھنسنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے تین اطراف سے وہ تین کتے میرے جسم کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے اُڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے سلطان بابا نظر آئے ”موت صرف جسم کا مقدر اور روح کی زندگی کی ابتدا ہے۔“ موت کے بارے میں ہم سب ساری زندگی سوچتے ہیں، سُنتے ہیں اور بات کرتے ہیں لیکن ٹھیک اس لمحے میں میں نے خود پر

موت کو وارد ہوتے محسوس کیا۔ ''اچھا تو یہ وہ فسانہ، جس کا سارے شہر میں چرچا تھا۔'' اچانک مجھے سانول کی بانسری سنائی دی۔ وہ دور سے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے مجھے بلا رہا تھا۔ نہیں...... سانول کی بانسری نہیں...... یہ تو اس پیانو کی آواز تھی، جو پاپا ہمیں بچپن میں روزانہ ڈنر کے بعد میری اور مما کی فرمائش پر سناتے تھے مما اور پاپا سفید ملبوسات میں اُسی بڑے سے کالے پیانو کے پاس کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے، ''بس کرو ساحر، اب گھر واپس آ بھی جاؤ۔ کتنا انتظار کرواتے ہو تم۔'' کچھ ہی دیر میں اُسی پیانو کے سامنے زہرا سیاہ لباس میں بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساحر کیا میری ہر محبت ہمیشہ یونہی تشنہ رہے گی؟'' میں نے گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو کاشف اور میرے باقی سارے دوست کالج میوزک شو کی تیاری کے لئے ڈرم اور گٹار بجا رہے تھے۔ کاشف چلایا ''اوئے ساحر کے بچے! آج پھر پریکٹس پر نہیں آئے تم۔'' نہیں یہ کالج کا ڈرم نہیں تھا، یہ تو وہی ڈھول تھا، جو جبروت کے ہرکارے ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے دوران پیٹ رہے تھے۔ کتے...... ہاں...... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں...... میں ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا تینوں کتے میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں کا زوردار چانٹا میرے گالوں کو جھلسا گیا۔ ڈوبتی آنکھوں سے میں نے تین اطراف سے بڑھتی موت کو گلے لگانے کے لئے سورج کو آخری الوداع کہا لیکن یہ کیا......؟ کتے میرے قریب آ کر رُک سے گئے کیا وہ مجھ سے میری آخری خواہش پوچھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر کی پچھلی جانب بھی کچھ غراہٹیں بلند ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ باقی تین کتے بھی آن پہنچے تھے لیکن اس وقت میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھ لیتا۔ سامنے والے تین دشمنوں میں سے ایک نے غرا کر اپنا جسم تولا۔ اُس کی ہڈیاں زقند لگانے سے پہلے جسم کے اندر چٹخیں۔ اُسے نے اپنا سارا بوجھ اپنے پچھلے پیروں پر ڈالا اور ہوا میں میری جانب اُچھلا۔ میں نے آسمان پر پگھلتے سورج کو اس کے وجود کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ مجھ پر دشمن کے قہر کا سایا ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا ایک عجیب بات ہوئی۔ ابھی دشمن کا جسم ہوا ہی میں معلق تھا کہ ایک اور جسم زوردار چنگھاڑ کے ساتھ غراتے ہوئے دشمن کے جسم سے لپٹا، ٹکرایا اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے مجھ سے دور لے جا کر ریت پر گر گیا۔ چند لمحوں کے لئے چھپا سورج پھر سے میری پلکوں میں برچھیاں گھونپ گیا اور میری آنکھیں پھر سے چندھیا گئیں۔ غراہٹیں اب باقاعدہ چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلٹ کر کروٹ لی اور حتی الامکان سر اُٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوا ہی سے میری جانب اُڑ کر آتی قضا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، دشمن کو ہوا ہی میں دبوچ لینے والا ''کالا'' تھا۔ وہ اور اُس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں میں تول رہے تھے غرا رہے تھے، دھمکا رہے تھے۔ میں کراہ کر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ دشمنوں کا سرغنہ بولا ''تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو۔ اس لئے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جاؤ، ہمارے راستے سے...... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تمہارا بھی مالک تھا۔'' کالا جواباً غرایا ''نہیں...... وہ کبھی میرا مالک تھا لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو اس کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ......'' سرغنہ بھونکا ''بس...... بہت ہو چکا...... کچھ ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرائے انسان کے چکر میں ہمارا اپنا پرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک ساتھ لڑی

ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں ان کے لئے اپنے ساتھ اپنے ان دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طرح سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں......ہٹ جاؤ......"

کالے نے جسم تولا...... "اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدار اور احسان فراموش بن کر نہیں...... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔" اتنے میں دور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا "اچھا تو پھر ٹھیک ہے............مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ......"

⁂

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

معصوم سے معصومیت تک

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رمق جا گی۔ باقی تین دشمن ابھی کچھ فاصلے پر تھے لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔ سامنے والے تین دشمنوں نے پینترا بدل کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کالا اور اُس کے گروہ کے باقی دو جانباز اب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید میرے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس خونی لڑائی کے گر جانتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے اور پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اُٹھا اور دشمنوں سے پہلو بچاتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے ننگے پیر میں ہاتھ کی اُنگلی جتنا ایک کانٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اُوپر سے نکل گیا۔ میں اُسی قدم لڑکھڑا کر گرا اور پاؤں جیسے شل ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانٹے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں سے علیحدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیفے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی پچھلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں اور پھر پہلے تین کا دشمن گروہ میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبڑے سے وار کیا لیکن میرے گلے میں بندھی قمیض کے چیتھڑوں کی وجہ سے اُس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب نہیں پائے۔ لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا۔ تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ کالے کا ایک ساتھی جو میری پہرے داری کے لئے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اُسے سرغنہ نے ایک زوردار پنجہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن اب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا تو بہت دور کالی تارکول کی سڑک کسی باریک دھاگے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اُترتے ہوئے آخری مرتبہ پیچھے نظر ڈالی تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو "ہم نے اپنا نمک حلال کر دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت......" اچانک میرے پیروں کو نیچے کسی نرم اور لجلجی سطح کا احساس ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دور دیکھ رہا تھا۔ یہ سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس ٹکڑے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اُسی سڑک کا تسلسل تھی لیکن یہ ٹکڑا ریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ خانو کی آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی۔ "اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ تم نے آدھی جنگ جیت لی۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن

کف بہاتے، رال ٹپکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے اُسی رفتار سے میرے تعاقب میں آرہے تھے بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں کی بچی کھچی سانسیں بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی ایک زندگی کے لئے ان پھیپھڑوں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشقت سر انجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آسمان کی جانب اُٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا۔ پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آسمان کی جانب کیوں اُٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی نہیں ہے۔ کیا وہ صرف آسمان پر ہی بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اُٹھی نظر نے بھی اُسی لمحے مجھے میری "بے ایمانی" کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور میں کسی مدہوش مے نوش کی طرح لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، تجلجی سڑک پر چاروں شانے چت پڑا تھا میری کہنیاں اور گھٹنے چھل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چور تھا کہ اب مجھے دوڑتی، غراتی، رال ٹپکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی لگ رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لئے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں، ایذا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس لمحے میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح کے ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کے اُصولوں کو بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اس دوڑ میں لا کھڑا کروں اور جب وہ بھی نڈھال ہو کر گر پڑیں، موت اپنے خونی جبڑے اُن کی شہ رگ میں پیوست کرنے لگے تو اُن سے بس ایک ہی سوال پوچھوں "کیا یہ بے وفا زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟" میرے دشمن بس اب چند گز ہی دور تھے۔ میں نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے اُن میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھ کر خوشی سے ہوکتے ہوئے سنا۔ انہیں بھی عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج اُن کے مساموں سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اُس کے خونی جبڑے کو ایک خاص زاویے پر کھلتے اور اس کے چار لمبے نوکیلے دانتوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اس قاتل جبلت کا خاص نشانہ میری شہ رگ ہی تھی۔ میرے دل نے کہا "خوش آمدید" اور ٹھیک اُسی لمحے فضا میں فائر کی ایک آواز گونجی۔ دشمن کی اپنی شہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے اُبلتے تارکول کو رنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز اُبھری جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا "اللہ اکبر" اور دوسرے فائر کی آواز آئی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور دشمن کی نبض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرف پلکوں کے بوجھ سے بوجھل ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کی نظر آپس میں ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے اس نے مجھ سے کہا "الوداع، اے دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔" لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں۔ آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی معصومیت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور روح کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کامیاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے

رخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ سمیٹنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ مجھے اس سڑک پر پڑے ان آخری لمحوں میں ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کا سفر بس ''معصوم سے معصومیت'' تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مارتھا سے ایک اصطلاح ہمیشہ سنتا تھا'' Back to the Innocence'' لیکن ''معصومیت کی طرف واپسی'' کی اس اصطلاح کا مطلب مجھے اس روز سمجھ آیا۔ ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی بنا دیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنا دے اور تمام عمر مذہب کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ''معصومیت سے معصومیت تک'' کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ اور شاید ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لئے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کول روح کو تحلیل ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے لتھڑے اس کثیف جسم کے پنجرے سے اس نورانی ہیولے کا نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ کیا میری روح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ آنکھیں کھلنے میں اتنی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک میرے کانوں میں آواز گونجی ''اُٹھ گیا بھئی جوانا! شاباشے۔'' میں نے چونک کر داہنی طرف آواز کی جانب دیکھا، رینجرز کا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ...... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا وہ پیراشوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ''اگر یہ سڑک تمہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے......'' میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سارے جسم میں شاید درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ سپاہی جلدی سے اُٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ''اوئے آرام سے جوان آرام سے۔ پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار شیر محمد ہے ہم چھ سپاہی ہیں اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر...... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں ہی چوکی سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دُور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان کتوں کو دوڑتے دیکھا۔ واہ بھئی...... عجب دوڑ تھی وہ بھی...... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوق لے کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے۔ ٹھیک لمحے پر اپنی بندوق اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، ورنہ مجھے بندوق پر لگے دوربین نشانے پر کبھی بھروسا نہیں رہا۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب آتے سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلانی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لئے بھی اگر میری اُنگلی کانپ جاتی تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سُننا پڑتیں۔'' حوالدار زور سے ہنسا ''وزیرا، وزیر محمد میرا پانچ سال کا بیٹا ہے......'' میں نے بستر سے اُترنے کی کوشش کی۔ ''مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے......'' ''وہ تو تمہاری دیوانہ وار دوڑ سے ہی پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریبی یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ وہ دو گھنٹے پہلے آ کر تمہیں ضروری انجکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے لیکن اس نے جاتے جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اُٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ویسے یہ ماجرا کیا تھا......؟'' میں نے جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لئے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے منہ کھولے میری بات سنتا رہا اور اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ یہاں سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آ سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ''کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔'' ''ہاں جی! کیوں نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔'' اُس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو

اُٹھا کر دو تین مرتبہ اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اُٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آخرکار پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اُٹھایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب نصیر صاحب کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تعارف کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو اُن کے لہجے میں فکرمندی کے ساتھ ساتھ روایتی پولیس والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لئے نکل چکے ہوں گے اور جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں نے سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صاحب سے بات کر کے خیمے کے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو وہ سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج کپتان صاحب سے شفٹ ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیپ میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیپ روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کود کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شیر محمد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اُسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ کچھ گھنٹے قبل ہی قاتل صحرا میری سانسیں گھونٹنے کے لئے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت جیپ میں گزرتے ہوئے سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیپ ریت کے ٹیلوں سے اُترتی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک ٹیلا اُترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا ”روکو..... جیپ روکو.....“ حوالدار نے چونک کر جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا، اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر اُن کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں وہ نظارہ دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر اِدھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدو جہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔“ میری آواز بمشکل نکلی ”نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لئے اپنی جان دی ہے۔“ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رووں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود بھی جیپ کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اُٹھا لایا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو منوں ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں جوان! تم اپنے دشمنوں کو بھی یوں پڑا رہنے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں اتنے ہی گہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے تو میں نے ایک جیپ کے ہیولے کو تیزی سے واپس پلٹتے دیکھا۔

لیکن شام کے جھٹپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح تھا۔ کتوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں اُن کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دور سے پولیس کی جیپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی بجھتی بتیاں قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جم غفیر ایک ایس پی اور ڈی ایس پی کی قیادت میں وہاں آ پہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی خاص ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رُخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور بولا "مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے اُستاد سے ملنے ضرور چلتا تمہارے ساتھ۔" میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اُس سے کہا "جب تم وزیرے کی ماں سے فون پر بات کرو تو اُسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے.....۔" جیپ میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے ہنس پڑا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میری معلومات کے مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا لیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فورس کو اچھی طرح ذہن نشین کروا دیے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طرف نکلتے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے جب کہ ایس پی صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی لیے کال گڑھ داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری ساری گنتی اُلٹی کر دیتا ہے۔ ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دوزخ سے نکلنے کے راستے اور گُر بتا دے گا اور میں اس کے جانبازوں کو کالے اور اُس کے دو ساتھیوں کے مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے کیوں کہ یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہوگا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر اتنی پہنچ بھی رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامند کر سکیں گے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا لیکن اس کی تمام توقعات کے برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی لیکن آدھے گھنٹے کے اندر ہی قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں کی طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اُس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زنداں سے برآمد ہوئے لیکن میری نظریں سلطان بابا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کوٹھڑی میں خود جھانک کر دیکھا لیکن اُن کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے بچھڑوں کے لیے رو رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔ لیکن خود جبروت نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اس کے دو مزید خاص ہرکاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں رُکنے لگیں۔ کہیں اُس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

نوری بھی اپنے باپ سمیت صحن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں

کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایات دینے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا تھا..... تم کامیاب واپس لوٹو گے.....“ آواز سنتے ہی میں نے چونک کر اُسے دیکھا، وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا سا ہو گیا۔

”یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا قلعہ چھان مارا ہے لیکن.....“ خانو چلایا ”ٹھہرو! وہ ضرور بابا کو قلعے کی اُس خفیہ سرنگ کے ذریعے لے جانے کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جا نکلتی ہے.....“ ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا کچھ سپاہوں کو خانو کے ساتھ اُس سرنگ کا پتا لگانے کے لئے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے روک دیا گیا۔

”آپ رک جائیں..... وہاں خطرہ ہو سکتا ہے.....“ میرے بس میں ہوتا تو سب سے آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اس کی بات سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ”سرنگ مل گئی ہے صاحب۔ وہاں ایک بوڑھا اوندھے منہ پڑا ہے۔“

❖ ...... ❖

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com

پہلا کفارہ

اُس سپاہی کی بات سن کر مجھے لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آ گرے گا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی اُس غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سرُنگ دکھانے کے لئے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے اندر جاتی سیڑھیاں نظر آ گئیں، جو بظاہر کسی تہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبروت جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں بھی ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے تھے۔ کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے۔ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا جمگھٹا تھا۔ انتہائی تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں آ رہی تھی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں بنے دائروں سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں وہ سلطان بابا ہی تھے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اُکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی اُن کے ہاتھ پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو اُٹھا کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب کسی سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا تو عقدہ کھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر بعد میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بظاہر گھٹن اور تھکن کے علاوہ کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں کسی بڑے اسپتال میں مکمل طبی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں تسلی دی کہ فی الوقت اُن میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کریں۔ البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی اور میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار اُن کا ماتھا چھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حدت سی محسوس ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے تصدیق کر دی۔ ”ہاں...... کچھ بخار سا تو ہے۔ لیکن اتنی تھکن کے بعد کوئی تشویش کی بات نہیں۔“ میں نے اُن سے جبروت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ میں سکینہ کے نانا نانی کو دیکھا تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود مجھے ہی تلاش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس وہی ایک تھا۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔ اچانک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اُسے اپنے

پاس بلایا۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھا "تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا......؟" ہاں۔ اور اسی لئے میں نے خود پولیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف "سلطانی گواہ" بنانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے ہر گناہ کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس کے لئے تیار ہوں۔ بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔" میں نے غور سے خانو کی طرف دیکھا۔ "نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا اصل کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بولو، منظور ہے؟" خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔ "تمہارے لئے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے؟" میں نے اُسے دور کھڑے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا "یہ بوڑھا اور بڑھیا اُسی سکینہ کے نانا نانی ہیں، جو اسی قلعے کی کھولی نمبر سات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ انہیں لے جا کر سکینہ کی قبر دکھاؤ اور اس بڑھیا کے شانوں پر پڑی وہ آدھی پھٹی ہوئی پھولوں والی چادر اُس بدنصیب کی قبر پر ڈال دو۔" خانو کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اُس کے قدموں تلے کوئی بچھو نکل آیا ہو۔ "نہیں نہیں! مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن......" "لیکن کیا؟ ابھی تو تم دعویٰ کر رہے تھے کہ کفارے کے لئے ہر حد سے گزر جاؤ گے۔ پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے پاؤں کیوں جلنے لگے......؟" وہ بے بسی سے تلملایا "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں اُن کا سامنا کیسے کروں گا؟" میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا "تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے۔ کیوں کہ تمہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر کے گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟" خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سکینہ کے بزرگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے اُن کی جانب دھکیل دیا۔ بڑھیا اپنے آس پاس سے گزرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی نے اُن کی سکینہ کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے اُس سے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے اُن دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ خانو کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دور سے بھی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کمزور و کم حوصلہ انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط کیوں سمجھتی ہے؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی ہے۔ کم ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ خانو کو اُن کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ساتھ ہی بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے۔ میں وہیں گم صم سا سلطان بابا کے سرہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بدنصیبوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ میں نے سکینہ کے نانا نانی کی آس سدا کے لئے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا اگر میں اُنہیں اُن کی عمر کے آخری چند سالوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ اُن کی لاڈلی نواسی گم شدہ، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں سے کتنے بہت سے انسان اپنی ساری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ "وہ مجھے چھوڑ گئی، لیکن بے وفا نہ تھی۔ وہ واپس لوٹا ہے تو پھر میرا ہی

ہوگا۔ ''''یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے۔'' یا پھر ''اگلی زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہی جی لیں۔'' تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا تو ایسا کیا گناہ ہو جاتا، لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں جھیلنی پڑتی ہے۔ انتظار تو خود پل پل وارد ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی اس اُونچی صلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید اُن کی پلکیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے اُن پر جھکا ''اب کیسے ہیں آپ...... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہوا کیا تھا؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ''ابھی تک بہت جلد باز ہو۔'' پھر انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے بتایا کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پولیس نفری لے کر قلعے کے دروازے پر آ پہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیپ والوں نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں، تو اُس نے سب سے پہلے حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اُس کے در پردہ ہم درد تھے، لیکن حسب معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پولیس کے دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قفل پڑا پایا۔ جبروت کے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گڑھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے سلطان بابا کو طلب کیا اور جھنجھلا کر اُن سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے، پولیس کی گاڑیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جاتے اُس نے اپنے ہرکاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم بھی دے دیا۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلطان بابا کو دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لئے زحمت بن گئے۔ جبروت آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے اُن کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہ خانے کی دیواروں میں چھپے، اس سرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے ہیں، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصراً سکینہ کے بارے میں بتایا تب تک اندر سے سکینہ کے نڈھال نانا نانی کو کچھ لوگ سہارا دیے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی، تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروا دی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور موذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت نڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے پکے صحن کو دھلوا کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج یہیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں۔ قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارا بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی، تو بستی کے سب ہی مکین نم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سکینہ کی آخری رُسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا ابھی اسی

حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سکینہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے۔ البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروا دیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اَن دیکھے تعلق کے اُلجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے بخیے اُدھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شباہت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے شکل ہوتی ہوگی اور مجھے سکینہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا۔ گویا وہ عکس روح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہ اُس وقت اپنی روح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا روح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور روح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل انجان اور نئے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی ساری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا چہرہ مل بھی جاتا ہے۔ تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی روح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں اُلجھتا ہی چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں سے چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دے جاتی ہیں۔ ضرور میرا اور سکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا معاملہ تھا۔ وہ میرے لئے بظاہر انجان ہونے کے باوجود انجان نہیں تھی۔ میرا سارا دن اسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکیے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوا دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لئے کال گڑھ آ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ''شاباشے جوانا شاباشے'' کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیپ میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا۔ وہ اُن کی سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ اُس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تب تک اُس نے سلطان بابا کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر رُخصت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ ہی میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آ کر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھٹک رہی تھی۔ جبروت اور اُس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی رینجرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کی سوچنے سمجھنے کی ہر

صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اُس کا مقدر تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سکینہ کا قتل ہی اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لئے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اُس کے چند گناہ دھو بھی ڈالتی، لیکن اُس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لی تھی۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اُس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اُس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آ جائے اور پھر مکمل خاموشی...... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس کے وائرلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور سا مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے عارضی صحرا میں قائم کردہ کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جو ان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا تھا، آج ایک بے جان لاشے کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار تو اُس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی تو اُن کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا "انا للہ وانا الیہ راجعون......" وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلتے ہی پہلے سانول اور پھر اُس کا باپ یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کا باپ بھی شرمندہ سا پیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے چپ کروایا۔ سانول کے باپ نے ساری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لئے بھیجے گئے رشتہ اور اس سارے معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھٹے، تو اُن کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سپنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے رُخصت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروا دوں تا کہ اُن کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لئے آ پہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کروانا ہے تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں سارے کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آ جائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہو گا۔ اُسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھروں کی دیواروں کی منڈیر دیئے جلا دیئے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلوا کر انہیں مائع لگا کر تیاری کیں۔ بوسکی کی دو گھوڑوں کے نشان والی قمیضیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اُوپر تک چوڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ،

پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے کوکے۔ جانے ایسی رسموں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جُڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتا ہوگا۔ اسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی در آتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ''خوشی'' نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ہی زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھڑیوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے جڑا ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل مسرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے۔ پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا۔ لیکن اس کے برعکس ''غم'' ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرح ہر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے۔ خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رُخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جب کہ غم کا کانٹا ایک دائمی چبھن، کاٹ اور جلن لیے دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ''الوداع'' لکھوا کر آتی ہے۔ اُسے کیوں اُٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہماری چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر پڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ''جاؤ مل آؤ، اس دو گھڑی کی ساتھی سے، میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔'' سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شور شرابے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر کے قریب پہنچا تو دور ہی سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ''کہ آج تم سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے...... لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو...... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں...... شاید وہ تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔'' عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑی والیوں کا جواب تھا ''ہاں ہاں...... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں...... بستی میں ایک ہی تو چھیل چھبیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرا میں جمع ہوتی تھیں...... خدا کرے آج اس زور کی آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آ جائے......'' سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور ٹپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے گم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان ہی نہیں پائی، لیکن ان کے الاپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں مرد قہقہے

لگا رہے تھے صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، تو سب ہی اُس جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی منظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بیک وقت جھلملا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے رنگ بیک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رُخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لگائی ''جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اُڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے...... '' سب زور سے ہنسے۔ دوسری ٹولی نے تان چھیڑی۔ ''مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے...... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرمے دانیاں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں...... '' سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس صحرائی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں...... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب علم، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اُردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی قے ہوئی ہے اور اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل بھر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہو گا۔ لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

* * *

دھانی

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ بھر کی تو یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی۔ لیکن کسی مریض کو بنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہمیں صبح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ دو دو کی ٹولیوں میں اُونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے لئے پانچ اُونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلا گاڑی بھی لگا دی جاتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ پہیے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں لہٰذا ہمیں اُونٹوں کے مضبوط قدموں ہی پر انحصار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اُونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جا رہے تھے۔ سلطان بابا میرے ساتھ تھے۔ سانول اور اس کا باپ ایک اونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک ساتھ سوار تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اُونٹوں پر تواتر سے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جب ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لئے باہر نکل آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سکینہ کے آخری پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو...... ''الوداع......''

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے۔ مگر جس وقت میں نے دور صحرا میں ریلوے اسٹیشن کی اُجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی مٹیالی سی گیس بتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر سے کہیں زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو کانٹا بدلنے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے، اس لئے ابھی کال گڑھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بچھے، لکڑی کے تختے نما بنچ پر لٹا دیا۔ نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم، چہرے افسردہ تھے۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے واپس جانے پر آمادہ کیا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ کے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب ترین شہر، رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک مزید کوئی اَن ہونی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے بڑے سے پلیٹ فارم کو چھوا تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے مما پپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجنے کو کہا۔ شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب

پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے، کینو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں ساری تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اُس وقت میری ساری توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچا اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آ گیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوائے۔ پپا رقم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا۔ اُس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گارڈ کو ڈانٹا کہ ”کتنی بار منع کیا، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔“

میں سلطان بابا کو انہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبالیہ کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ وہ چیک کرے کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اُس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پاپا نے اتنے پیسے بھیج دیے تھے اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کہ ”اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے۔“ اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحائی بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے حوش و حواش میں تھے۔ اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خواہ مخواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے کر آیا ہوں۔ بقول اُن کے وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور اُن کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس سارے ہنگامے میں شام ہو چکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آ گھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسپتال کے اصول بھی اٹل تھے ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ ایک بزرگ جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے بوکھلائے ہوئے سے دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس سے پوچھنے لگے۔ ”کیا عبداللہ صاحب کا یہی کمرہ ہے۔ میرا نام شیخ امتیاز ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا۔ اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا پتا صبح نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔ میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے میں آ گیا اور انہیں سلام کیا۔ ”جی...... میرا نام عبداللہ ہے“ وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ملنے لگے۔ ”اوہ! معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔ مجھے نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت ناساز تھی۔“ میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور نصیر صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیارٹی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت قریب تھے اور یہ تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے

فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے سلطان بابا سے درخواست کی کہ اُن کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ وہ یہاں تک آ گئے، یہی اُن کے لئے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا تو نرس نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے لیکن چہرے کے تاثرات چھپا گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے اُن کی حیرت بجا تھی کہ کاغذ کے اُن مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہیں سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا لیتے رہیں۔ شیخ صاحب جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ساری بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ”آپ اس نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا اور صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔“ سلطان بابا میرے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ کر سمجھ گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کترا رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد رہتا ہے۔ کسی اور کے کرم پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا تب بھی مجھے گھر کی پابندیاں اور مما پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی کی چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مٹرگشت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے ہارن بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بند دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا واسطے کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی۔ اور شاید وہ آوارہ گرد سا حراب بھی مجھ میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں کہیں بھی آزادی محسوس کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی میری ہچکچاہٹ جان گئے مسکرا کر بولے ”بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے تو ضرور کہیں اور ٹھہر جانا۔ کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار رُوٹھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میرے شہر میں اُس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا......؟“ سلطان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے تو اُن کی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کچھ ہی دیر میں ہم اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا غائبانہ تعارف بھی کروایا۔ اُن کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا۔ اُس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ بیٹے سے چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چپ چاپ اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دلچسپی میں پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات بتانے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی اثناء میں اُن کا گھر بھی آ گیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرا میں گزارنے کے بعد اتنا زیادہ سبزہ اور ہرے بھرے درخت

دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ وائٹ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لو کی جگہ گاڑی سے اُترتے ہی بھیگی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے نے میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھیلا تھام لیا۔ شیخ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات کے کھانے کے لئے میری پسند پوچھی تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو وہی میری پسند ہوگا۔ میں نوکروں کے پیچھے انیکسی کی طرف بڑھنے لگا تو انہیں کچھ یاد آیا ”ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے شہریار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں۔ اُمید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔ تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ..... ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے۔“ میں انیکسی پہنچا تو بنگلے کا ایک پورا حصہ مہمان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغیچہ بھی اسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی میں چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لئے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے ساتھ والے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ گھر کافی کشادہ اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تاریک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، میں اب اُسی ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود اپنے اندر ہی بناتے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت پر بھی میں سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پگلے من کو بہلانے کی ہوتی ہے۔ اور ہم سے جو کوئی بھی یہ من بہلاوے کا گُر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انیکسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ اور شہریار صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیو نوجوان نے اُٹھ کر میرا استقبال کیا۔ ”ہیلو! مجھے شہریار کہتے ہیں۔“ میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ ”میں عبداللہ ہوں۔“ شہریار مسکرایا..... ”عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں۔ یعنی اللہ کے بندے۔“ شیخ صاحب زور سے ہنسے ”ارے بھئی اس کی بات کا بُرا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھیلنا ہی شہریار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ٹھہرے۔ آج کل یہاں بھی اپنے کسی منصوبے کے لئے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔“ میں بھی دھیرے سے مسکرایا ”پھر تو ان سے ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔“ اُن دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا کہ شہریار ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک جگہ بیٹھ کر لکھنے کی بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہریار کو مختصراً سلطان بابا کے بارے میں بتا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رُخصت ہو کر آرام کے لئے چلے گئے۔ میں اور شہریار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انیکسی کی پشت پر موجود باغیچے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قمقمے لگائے گئے تھے۔

لہٰذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا۔ میری توجہ ابھی اس لان کی انتہائی نفاست سے تراشی گئی باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے پڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اُٹھا۔ میں زور سے چونکا، رات کے ساڑھے بارہ بجنے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال کی طرف گیا اور کسی اَن جانے وسوسے کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیو اُٹھا لیا۔ ”جی.....“ دوسری جانب خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا ”جی فرمائیے“ دوسرے جانب سے ایک نازک سے نسوانی آواز اُبھری۔ جی آپ کون؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔“ دوسرے جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی رانگ نمبر تھا۔ میں گہرے سانس لے کر اُٹھنے ہی کو تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ جی میں آیا کہ ریسیو اُٹھا کر نیچے رکھ دوں، لیکن نہ جانے اس فون کی دوسری لائن کہاں تھی۔ اس طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ ریسیو اُٹھایا۔ دوسرے جانب وہی آواز تھی۔ ”جی..... شہریار.....؟“ اوہ تو یہ شہریار کے لیے فون تھا۔ میں نے جواب دیا ”نہیں..... شہریار صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔“ دوسرے جانب پھر وہی جلترنگ بجا۔ ”اوہ..... معاف کیجیے گا۔ آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون رکھ دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اُٹھائیے گا۔“ شہریار خود اُٹھا لیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دو ایکس ٹینشنز ہیں۔“ میں نے ریسیو واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید دوسری جانب سے شہریار نے فون اُٹھا لیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھٹن ستانے لگی، حالانکہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہریار نے اندر جھانکا ”ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود بدتہذیبی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی اور تمہاری نیند شاید بار بار اس فون کی بجتی گھنٹی نے اُڑا دی ہے۔“ میں خوش دلی سے مسکرایا ”نہیں! میری نیند ازل سے اُڑی ہوئی ہے۔ شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اندر آ جاؤ۔“ شہریار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا ”واہ خوب کہی۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹر ہی دکھتے ہو۔“ میں ہنس کر ٹال گیا اُلٹا شہریار سے سوال کر دیا ”تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ نہیں۔“ شہریار نے ایک لمبی سی سانس لی ”اب کیا بتاؤں۔ پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا ہوں۔“ ”کیوں..... خیریت.....؟“ ”ہاں فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور مقصد کے لئے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم سفر انتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ چونکہ ابھی تک کوئی مہ جبیں میری نظروں میں سمائی نہیں، لہٰذا اس چناؤ کے لئے اپنی پہلی تلاش اسی گھر سے شروع کروں۔ اور یہیں سے میری اُلجھن کا آغاز ہوتا ہے۔“ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”اس میں اُلجھن کیسی شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو۔ اور پھر دونوں میں سے جو بھی دل کو بھائے اُس کے لئے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو نہ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو اپنے ڈیڈی کو اطلاع کر دینا۔“ شہریار نے پھر ایک آہ بھری ”یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں بڑی والی بھا گئی ہے..... کیا کہوں کہ وہ میر کی غزل ہے یا خیال کی رُباعی، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر نگاری.....“ میں مسکرا دیا۔ ”تو پھر اُلجھن کیا ہے۔ پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آ کر تمہارے لئے اُس کا ہاتھ مانگ لیں۔“ شہریار جلدی سے بولا۔ ”وہ ہے ہی ایسی۔ ابھی کچھ دیر

پہلے تم نے فون سے اُسی کی آواز سنی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اُس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، لٹریچر تو جیسے وہ سارے کا سارا گھول کر پی چکی ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر وہ بات نہیں کر سکتی...... لیکن صرف فون پر...... جیسے ہی وہ سامنے آتی ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اس کی۔” “تو کیا اُسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے اُن کے ہاں ٹھہرنے کی اصل وجہ کیا ہے......؟” شہریار مسکرا دیا “ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل بھی اپنی اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مقصد بتا دیا ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں۔ لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اُس سے تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی تو میرے کان وہ سب کچھ سننے کے لئے ترستے ہی رہے جو میں فون پر اُس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونوں بہنیں بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے کبھی یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی ہیں۔” مجھے شہریار کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ اُس نے شکوہ کیا “ہاں تم! بھی ہنس لو۔ اپنی صورت حال ہی کچھ ایسی ہی ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری ہنسی اڑاتے ہیں۔” “میں نے اُسے چھیڑا “تم خواہ مخواہ کہانی کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔ ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو تمہارے آس پاس چل رہی ہے۔” شہریار نے قریب پڑا کشن اپنے سر کے پیچھے رکھا “ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لئے پورے ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آ گیا ہے۔ اب مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے لئے زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے غور سے شہریار کی جانب دیکھا “ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی اس محبت کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لئے ایک اجنبی ہی تو ہوں۔” “شہریار مسکرایا “ہم بھی لکھاری ہیں۔ میاں چلتے پھرتے بہت کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا کہ ہمیں ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لئے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ نہیں ہو، جس کا بھیس تم نے بھر رکھا ہے۔” “میں نے چونک کر اُسے دیکھا “اچھا......؟ اتنی جلدی ہی نتیجہ کیسے اخذ کر لیا تم نے۔” “شہریار میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی میز پر زیادہ تر اٹالین اور چائنیز ڈشز موجود تھیں۔ اگرچہ تم نے چھری کانٹے کا استعمال حتی الامکان کم سے کم کیا لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھ کر کوئی بھی آسانی سے بتا سکتا ہے کہ تم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہو۔” “میں نے حیرت سے شہریار کی طرف دیکھا۔ واقعی کمال کا مشاہدہ تھا اس کا۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اُس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اُسے داد دی۔ “واہ بھئی...... مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔” “شہریار زور سے ہنسا۔ “تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی فین ہو۔” میں بھی ہنس پڑا۔ “چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معمے کا کیا کرو گے، جس نے تمہاری راتوں کی نیند اُڑا دی ہے۔” “شہریار نے سر کھجایا۔ معما تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہو جائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہو جاتی ہے۔ شہریار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ لہٰذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے

مجھے کمرے سے نکلتے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے۔ البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہریار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک اُن کے تمام ضروری معائنے بھی ہو گئے۔ جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی تو انہوں نے منع کر دیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہو آؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں ان کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہریار اور اُن کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگا دی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع قطع کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا۔ ”عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحبزادی ہیں، شاہانہ، ہماری شانی۔“ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، بیچ میں مانگ نکالے سلونی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہماری جانب آ گئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل اُلٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پاجامہ پہنے لمبی سی چٹیا بنائے۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا۔ ”اور بھی...... یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحبزادی...... دھانی......“

* * *

لفظ گر

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے تو شاید میں کبھی انہیں سگی بہنیں نہیں مانتا۔ ان دونوں کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا۔ البتہ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی طبیعت کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں تو کچھ دن ان سب کے ساتھ یہیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک پہنچا دوں گا۔ شہریار کی ساری توجہ شاہانہ پر تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اُٹھ چکے تھے۔ شہریار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کے کمرے میں تین چار سینیئر ڈاکٹروں کا جمگھٹا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ مجھ پر دس صدیوں جیسا بھاری گزرا۔ پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر مسکرایا۔ ”اوہ ہاں...... ڈونٹ وری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب آپ لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔“ اُن کی بات سن کر میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لئے دوا اور اُس کے تیمارداروں کے لئے مسکراہٹ سے بڑھ کر اور بھلا کیا سوغات ہو گی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مسکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی ہے اور بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اور اس لمحے مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔

سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ”میں نے کہا تھا نہ کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی رہائی، ان ڈاکٹروں کی مرضی ہی سے ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بروز نئی محبتیں تراشیں گے مجھے یہاں روکنے کے لئے......“ مجھے اُن کی ”رہائی“ والی اصطلاح پر ہنسی آ گئی۔ ”ہاں...... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے لئے ہیں تو انہیں حلال بھی تو کرنا ہے۔“ میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیے۔ ”ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پوری۔ لیکن یاد رہے...... جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ تلپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا کوئی نہ کوئی انہونی ضرور پیش آئی۔ میرے لبوں

سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ ”آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لئے شفایابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟“ وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے لئے، تمہارے لئے بلکہ سب کے لئے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لئے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں۔ اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو...... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں لہٰذا نتائج کی پرواہ ہمیشہ اُسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے...... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لئے دعا کرنے کی تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدوں کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھونے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، پٹھے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں۔ اب ان اعضا کے ساتھ جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود روح کے نکلنے کا نام ہے جو نکلتے نکلتے سو سال سے بھی زیادہ عرصہ لے سکتی ہے۔ اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویے کی وجہ سے بآسانی اتنی عمر کا سفر بھی طے کر لیتے ہیں، جب کہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی روح پل بھر میں نکل جاتی ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں...... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری روح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔“ میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار میرے ذہن کے دریچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا۔ جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ آپس میں اُلجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ”اسی لئے ہمارے معاشرے میں عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی دینی اور دنیاوی معمولات کا خاکہ بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ وقت دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دبی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دہائیاں شروع ہو چکی ہیں تو بہتر ہے کہ اب اُوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا۔ یہ ساری کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پروارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ روح کا برتاؤ ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری روح کو ہمارا یہ جسم چھوڑنا ہوتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس روح اور جسم کی دائمی جدائی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اُسے روز حشر پھر سے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع

ہوگا۔ اسی لئے ہمیں اس دنیا کے لئے اُسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔" سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے تھے لیکن میرا ذہن حسبِ معمول کچھ نئے سوالوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم روح صرف ہمارے کیے گئے گناہوں کی سزا بھگتتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو "ذہن" کی کارستانیوں کا شاخسانہ ہے.....؟

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آ کر مجھے کل والی بات کی یاددہانی کروائی کہ تیمارداروں کو رات گزارنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آ پہنچے اور پندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھنے کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اُصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے راستے میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جانے کیوں اُن کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا ہے اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر لوگوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بہرحال انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچا لیا کیوں کہ اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو ان کا چھوٹا بیٹا وقار کار پورچ سے ذرا پرے اپنی ڈی ٹی ایس ہیوی بائیک کی ریس چیک کرنے کے لئے اس کے پچھلے پہیے کو اسٹینڈ کے ذریعے اُونچا کر کے ہائیڈ رولک جیک لگا رہا تھا۔ سارے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند پل ہی میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہر اتوار کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بائیکس کھول کر اسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور سارا گھر سر پر اُٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے پل کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ملنے پر یا دیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر ہی رہتا۔ پھر شام کو جب پاپا گھر واپس آتے تو اُن کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جرمانہ بھرنا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ رُکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ "کیوں عبداللہ سب ٹھیک تو ہے نا......" میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اُس نے ہائیڈ رولک تیل کی لمبی گلاس نما کپی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پہیے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے ایکسیلیٹر چھوڑ دیا لیکن پہیہ اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی کپی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ "جب تک پہیہ مکمل طور پر رک نہ جائے اور بائیک کا انجن ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا۔ ورنہ یہ آئل صرف پہیے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا۔ پھر کئی دن تک بائیک بار بار چوک ہوتی رہے گی......" وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میری بات سنتا رہا۔ پھر اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "اوہ! تو یہی وجہ تھی کہ بائیک پوری ریس نہیں اُٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام سمجھ کر تیل دیئے جا رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اُسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے

ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف چلنے لگا اور اپنی بائیک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اُس کے ڈیڈ نے اُسے یہ بائیک لے کر دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہدایتی کتابچہ (Manual Guide) نہیں ملا۔ کیوں کہ بائیک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہٰذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے۔ لیکن آج شہریار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا لیکن کھانا لگنے تک شہریار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹھا...... ”عبداللہ بھائی کیا آپ مولوی ہیں؟“ شیخ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ہاں لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی فی الحال آدھا مولوی ہوں۔“ وقار اور شہریار بھی مسکرا دیے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ”آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو اُن کی یاد نہیں آتی؟“ شیخ صاحب نے اُسے ڈانٹا۔ ”وقار! یہ کیا بدتہذیبی ہے؟“ میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ”کوئی بات نہیں اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھئی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دُور رہتے ہیں اور مجھے اُن کی یاد بھی بہت آتی ہے۔“ ”تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اُن کی بہت یاد آتی ہے کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے ایک رات بھی دور نہیں رہ سکتا۔“ ”رہ تو میں بھی نہیں سکتا، پر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے نا۔ البتہ جب گھر والے بہت یاد آتے ہیں تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔“ وقار زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے، آپ روتے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔“ ”تو کیا ہوا۔ بڑے روتے نہیں کیا؟ میں تو سمجھتا ہوں بڑوں کو چاہے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح اُن کا دل کبھی سخت نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔“ اب شیخ صاحب اور شہریار بھی ہماری اس ”معصوم“ بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل کا ایک شک زبان سے اگل دیا۔ ”آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یوں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس راستے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ گیا۔ شہریار نے بھی چونک کر اُوپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ”وقار یور مائنڈ یور اون بزنس۔“ میں نے ہاتھ اُٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ”تم انتہا پسندی کسے کہتے ہو......“ وقار کچھ ہچکچایا۔ ”وہی جو لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”دیکھو! یہ پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہریار کو پریشانی ہوگی۔ بالکل اُسی طرح، جیسے تمہارے ڈی ٹی ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے تو لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے تم کسی کو زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لئے کسی بھی طرح کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں صرف مذہب ہی سے وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویے کا نام ہے۔ تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن سکتے ہو۔ شہریار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے بیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں۔ لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں کچھ سیکھنے کے

لئے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اُسے پریشان کرنا نہیں بلکہ سچ تو یہ کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے اس مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت دور کی بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خود عبادت میں بھی اسی اعتدال کو مدنظر رکھنے کا حکم ہے۔ تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جا سکتا ہے......؟"

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے خود ہی وقار سے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اُس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرایا...... "نہیں عبداللہ بھائی...... میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کتراتا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔" شیخ صاحب کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ شہریار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے شہریار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ "ٹھیک ہے جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ "میں جانتا ہوں تمہاری ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا۔ تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔" نماز کے بعد میں شہریار کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوتا تھا۔ بہت سے اَدھ جلے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگاتار سگریٹ نوش ہو گے۔" شہریار نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ "نہیں...... ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر اُلجھ جائے تو پھر یہ نکوٹین ہی میرے سوچوں کی رُکی ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔" "مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ کڑوا دھواں تم جیسے لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جادو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے ہیں؟" مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا...... "کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال اٹک گیا ہے، تمہارے اندر جسے اس دھوئیں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟" شہریار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لئے اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شہریار نے جلدی سے فون اُٹھا لیا۔ دوسرے جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہریار نے جواب کے بعد کہا "زہے نصیب...... کہیے آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا......؟" میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن شہریار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھا لیا۔ مجھے اُن کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہریار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔" دوسری جانب کی بات سن کر شہریار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ "چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا تھا۔" فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ "کافی چلے گی......؟" "نہیں! میری کفین سے کچھ زیادہ بنتی نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔" شہریار کسی گہری اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ "پتا نہیں کیوں تم سے ہر اُلجھن بانٹنے کو

جی چاہتا ہے۔ ہم رائٹرز ویسے بھی بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا بن جاتا ہے۔” میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ “تم کچھ اُلجھے ہوئے سے لگتے ہو؟” “ہاں...... ایک عجیب سی بات ہے شاید میرا وہم ہی ہو لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے۔ سامنے آنے پر وہ اس کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم وحیا کے زمرے میں تولتا رہا، لیکن ایک آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا تو وہ بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔”

میں غور سے اُس کی بات سنتا رہا۔ “تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوزانو ہوئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں طاق ہو۔ ہو سکتا ہے اُسے خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ ”تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے“ تو ہو سکتا ہے اُسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہوتے ہوں۔” شہریار اب بھی بے چین تھا۔ “ہاں! ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اُسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور اُن سے بنے اَن چھوئے خیالات ہی میری کمزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کرتی ہے......؟” “یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا؟” “پوچھا تھا۔ اس نے بھی کم وبیش وہی تمہارا جواب دھرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔”

اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ اُن کا بڑا بیٹا امجد اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش و نگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں۔ جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا وقار اپنی مرحومہ ماں کے حسن اور رنگ و روپ سے جڑے ہوئے تھے۔ اسی لئے شانی اور دھانی کے نقش اس قدر مختلف تھے۔ لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر شیخ صاحب کی تمام اولاد میں بے حد ایکا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں۔ البتہ شانی کے مقابلے میں دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اُس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اُس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیئے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی دھانی رنگ میں اس کی شخصیت کا ایک حصہ بنتا گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کلر، پنسلیں، پھر کالج بیگ اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھ کی چوڑیاں، ہیئر بینڈ یا پھر پرس...... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر بھر کی کٹلری، پردوں صوفوں کی کلر اسکیم حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پرسکون، ٹھہری ہوئی اور ساکت تھی۔ البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی اور تھرکتی ہوئی۔ سارا گھر اُسی کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی نہ ہی کسی کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے اس مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوبصورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرمان بردار تھے البتہ۔ گھر کا سارا انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اُس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اُسے خوش آمدید کہا۔ لیکن........ جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی،

وہ شانی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو سکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی دستک سننے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انیکسی میں وہ اس کی دوسری رات تھی، جب فون کی گھنٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اس نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ یہ کسوٹی بھی اس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ وہی اُسے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے اُن کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپا وہ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اُس کی گھنیری پلکوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ لیکن شہریار نے مزید کئی دن لئے رات والی اُس آواز کو اُس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اُس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہزادی کچھ ایسی ہی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی ان ملائم لفظوں اور کومل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اُس کی سماعتوں میں انڈیلتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اُسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ پکڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد سوچ اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اُس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی چائے پر باغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ تب جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں اچانک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسری گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اُسے لانا تھا۔ لیکن شہریار کے تشنہ کان شانی کے لبوں سے کچھ سننے کی آرزو ہی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ”ہوں ہاں“ کر کے شہریار کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اسی بات نے شہریار کو اُلجھا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ درپردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لئے اپنے رضامندی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کیوں کہ اگلے ماہ اُس کے گھر والے باقاعدہ اس پری رُخ کو شہریار کے لئے مانگنے آ رہے تھے اور شاید شہریار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہریار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہریار نے غالباً اپنے پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو راکھ میں تبدیل کیا ہی تھا۔ کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میں شہریار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دھیرے دھیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہریار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں ٹکی؟ دھانی بھی تو اُسی گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہماری نظر ہمیشہ روشن اور اُجلے چہروں ہی میں کیوں اُلجھتی ہے۔ یہ خوبصورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظر ہی پر منحصر ہوتی ہے تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رُکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لئے بھی پہلی ہی جھلک میں اس طرح کیوں نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رُکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لئے بھی پہلی ہی جھلک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ وش کی پوری پلکیں گرنے سے پہلے ہی اُس کے لئے دوزانو ہو چکا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور کچھ ہلکے دھندلے بنا ڈالے۔ اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ہماری نظر اور ہمارے دلوں

میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا۔ کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہریار خود اُٹھا لے گا۔ گھنٹی لگاتار بجتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہو گئی۔ شاید شہریار نے اُٹھا لیا تھا پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہریار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے پنجوں پہ جمائیاں لیتا کھڑا نظر آیا۔ ”عبداللہ فون اُٹھاؤ.......... تمہارے لئے کال ہے۔“ میں چونک گیا۔ ”میرا فون.......... اس وقت..........“ شہریار پلٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے فون اُٹھایا ”جی کون ہے..........؟“ دوسری جانب کچھ خاموشی کے بعد آواز اُبھری۔ ”جی ....میں دھانی بول رہی ہوں..........“

❀......❀

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

میرا ہر لفظ تمہارا ہے

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ''جی..........؟'' وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھنکار کر دوبارہ بولی ''میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں۔'' میں سنبھل چکا تھا ''جی فرمایئے..........'' وہ کچھ اُلجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ''وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔'' وہ کچھ ہچکچائی ''تمہید تو میں نے باندھ دی ہے۔ اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں۔'' چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر اُبھری ''آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی۔ نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدفِ تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''یقین کریں وہ بات تو بس یونہی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔'' ''شکریہ۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر اُن کو دیکھ آئیں۔'' ''جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔'' پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔ شانی جھجکتے ہوئے بولی ''دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم اُن کی ذرہ برابر خفگی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ تو گویا یہ ساری گفتگو شیخ صاحب کی ناراضگی دور کرنے کے لیے تھی۔ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔'' میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے ساتھ اس پتھریلی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضمحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں بے چین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی۔ اُس نے مسکرا کر تسلی دی۔ ''ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بہت کم ہے۔'' میری پریشانی دور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ''لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو ان کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ان کی فائل کھولی اور آسان لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہمیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ اُن کے داہنی جانب آخری تین پسلیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جگر کی بیرونی سطح تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرنا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دماغ کی شریانوں

میں خون کی روانی میں ایک لمحے کی رُکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا زیادہ دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ رُکاوٹ خون سے بنے ریت کے ایک ذرے سے بھی باریک لوتھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوتھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اسے تھرومبس اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے تو اسے طب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم فی الحال تو کسی ایسے چپکنے یا بہنے والے لوتھڑے سے بچے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں۔ تو بس فی الحال ہماری اتنی سی جنگ ہے، ان کی بیماری کے ساتھ اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔" ڈاکٹر نے کسی مستند تجربہ کار کی طرح مجھے تسلی دی۔ لیکن اُس کی باتیں سننے کے بعد میرا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔ میں واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی تختی پر بکھری سیاہی کو غور سے پڑھا "تم بھی آ گئے، ان ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانسیں باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور جب سانس پوری ہوئی تو ان ڈاکٹروں کی ساری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے پائے گی۔ پھر اس جھمیلے میں کیوں پڑتے ہو؟" میں نے انہیں غور سے دیکھا "میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن اس کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرح کی دعا ہے۔ یہ بھی تو امید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ مجھے دوا کی دعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے تو میری دوا کی یہ دعا آپ کی نسوں میں بہتے خون کے خلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی ہے کہ تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اس کو مایوس نہ کرنا۔" میں نہ جانے کتنی دیر تک بولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا تو اُن کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا "ارے.......... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار گزری کیا؟" انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ "نہیں۔ یہ آنسو بھی اُس کی شکر گزاری کے ہیں۔ آج پہلی بار عبداللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں اُستاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے رہو، خوش رہو۔" میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ "یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے تھے۔ میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔" میں بہت دیر اُن کے سرہانے بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ انہیں غنودگی سی ہونے لگی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے اُن کا کاندھا ہلا کر نماز کے لئے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے باہر کچھ آہٹیں اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہریار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سلطان بابا اُن سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے، کبھی زہر تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور ان کے خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں اُن کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیئے تھے۔ جب شیخ صاحب نے شہریار کا اُن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ وہ بہت جلد اُن کی فرزندی میں آنے والا ہے تو سلطان بابا نے مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا "کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے ہو۔" شہریار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا "جی.......... وہ.......... میرا

مطلب ہے............ "ہم سب شہریار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی "جیتے رہو اور ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام سے ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو تو پانچ وقت اُس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند کر لو خود کو۔" شہریار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل شروع کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی اُن کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی دعا دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔

سلطان بابا کا کمرہ اُن کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا، لیکن ڈاکٹر نے پرہیز کی پابندی بتا کر اُن سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب کے گھر کا دوسرا ڈرائیور جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ شہریار میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر دھانی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلافِ معمول شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہریار کو چھیڑا۔ "عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اس کے برعکس کیوں ہے۔؟" شہریار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری "جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا۔ کریدتے ہو راکھ، آخر یہ جستجو کیا ہے.......... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے۔ اب راکھ کریدنے سے تمہیں بھی کچھ حاصل نہ ہوگا اے دوست۔"

میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارا ہوٹل کی ذیلی شاہراہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کے میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب بولے "بھئی لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہٰذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند بتا دیں۔" کچھ ہی دیر میں مستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک پکی عمر کا موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی دُھنیں چھیڑ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی دھن لکھ کر ارد گرد پھرتے بیرے کی ٹرے میں ڈال دیتے جو فوراً اُسے پیانسٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ پیانسٹ مسکرا کر اپنا سر ہلاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ دُھن بجاتے ہوئے اُس کی انگلیاں پیانوں کی لمبی سفید کیز پر تھرک رہی ہوتیں تو اُس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اُٹھتی رہتیں۔ سچ ہے کہ دنیا کا ہر ہنر مند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال میں سیلون کی لکڑی سے بنا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران اور کبھی تنہائی میں بجاتے تھے۔ اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے مجھے پیانسٹ بہت ہنر مند اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جھرنا کچھ اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے ارد گرد روشنی کا انتظام کچھ اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدہم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی تخلیے میں ہے، اور شاید تخلیے و تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور پُرسکون بنائے ہوئے تھا۔ صاحبِ حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اس احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم و بیش یہی ذائقہ ہر دسترخوان پر اُن کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔

وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کھانے کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف دُھنوں کی فرمائش شروع کر دی۔ پیانسٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہٰذا اب اُس کی پوری توجہ ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پپا اسٹیو وِنڈر کے اسی نغمے کی دھن بہت شوق سے بجاتے تھے ''ہیلو......... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری مخمور آنکھوں اور تمہاری گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دلربا......... کہ میں انجان ہوں......... یا پھر میں ابھی ان ہی لفظوں کے طلسم سے شروع کروں......... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' پیانسٹ نے دُھن ختم کی تو سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اُس نے چٹ بھیجی، ''لاپرواہ سرگوشیاں(Careless whispers)......... میری بہترین دوست ہیں......... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ میرے بوجھل قدم بنا تال کے ہیں.........'' بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارج مائیکل، ویم اور ماڈرن ٹالکنگ کے پرانے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک سٹریٹ بوائز اور برٹنی سپیئرز کے نئے نغموں کی دُھنوں پر پیانسٹ کو آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مسکراتے رہے، جیسے اُن کا یہاں سے اُٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے ڈھلتی رات کا فسوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے والے ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ ہمارے دن اور رات کے رویوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات ہمیں بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہمارے اندر چھپے بہت سے خوابیدہ جذبوں کا براہ راست تعلق رات سے ہوتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے ایسا خواب ناک ماحول میسر ہو تو یہ جذبے اپنی پوری قوت سے ہماری شخصیت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ہماری باتیں نشیلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لہجے ملائم......... بعض اوقات ہمیں خود سے ہی پیار ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر چھپے کسی معصوم بچے کی ہر ضد مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری کا چولا اُتار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی رومان پسند شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے ہیں نشے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہے۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نشے کی طرح ہی ہمارے خون میں تحلیل ہو کر ہمیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر سکتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ پیانسٹ نے تار چھیڑے ''صرف لفظ......... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں میرے پاس......... تمہیں دینے کے لئے.........'' اچانک ہی دھانی نے کھوئے کھوئے سے شہریار سے پوچھا۔ ''آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے اپنی آنے والی تحریر کے بارے میں۔'' شہریار کچھ چونک سا گیا۔ ''آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا ہوں، جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی ہر نئی آنے والی کتاب مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ لوگ بے چینی سے اس کے قلم سے بکھرے لفظوں کی مالا چُننے کے لئے اس کی تحریر کا انتظار کرتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے پاس اپنے گھر میں بولنے کے لئے صرف خاموشی ہے۔ اس لکھاری کی شریک حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں باتیں کرتے ہیں۔'' شاہانہ کی ساری توجہ اب شہریار کی جانب تھی۔ دھانی نے دلچسپی سے پوچھا ''لیکن ایسا کیوں.........؟ کیا لکھاری کی شریک حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر میں کھویا رہتا ہے؟'' شہریار نے غور سے شانی کو دیکھا۔ ''نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی ساتھی تو اُس کے لفظوں کے لئے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری

محبت بھی اُس کی شریک حیات ہی ہے۔ لیکن اُسے کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لئے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی وہی لفظ ادا کرنا، جو اس کے مختلف کردار ایک دوسرے کے لئے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے ہیں، اُسے یہ ادائیگی کچھ معیوب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں اور جذبوں کی بے ساختہ زبانی ادائیگی کو دکھاوا نہ سمجھ لیا جائے، لہٰذا اپنی شریک حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً خاموش ہی رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریک حیات کی اُلجھن شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر آس پاس لوگ اور اُس لڑکی کی سہیلیاں اُس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریک حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ اسے ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لئے لکھاری کے پرستار مہینوں انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اُس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اسی کش مکش اور ذہنی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خاموشی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' شانی اور دھانی بہت غور سے شہریار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری طرح متوجہ تھے۔ اُن سے شہریار کی خاموشی کا لمبا وقفہ برداشت نہیں ہوسکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ''تمہاری اس کہانی کا عنوان کیا ہے؟'' شہریار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی......... ''میرا ہر لفظ تمہارا ہے، لیکن میری کہانی کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجئے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔'' کچھ دیر کے لئے ماحول پر خاموشی طاری رہی۔ پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ''انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جدائی کے بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور محبت ادائیگی کے لئے تخلیق شدہ ہے۔ لہٰذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کرنا ہوں گے۔ کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لئے ان کی ادائیگی سدا بہار رہتی ہے۔ لہٰذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زندگی میں واپس لے آنا چاہیے۔'' شہریار نے مجھ پر نظر ڈالی ''اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔'' میں شہریار سے ایسے کسی سوال کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔ ''مجھے لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی طبعی میعاد کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو برتنا پڑتا ہے۔ ورنہ مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی روح کا باعث ہوتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکس پائیری ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔''

کہانی کا انجام طے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ راستے میں بھی شہریار خاموش رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے وہ اچانک ہی کسی خیال کے اثر سے باہر آیا۔ ''آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.........؟'' میں سمجھ گیا کہ شہریار کا اشارہ کس جانب ہے۔ ''نہیں......... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پلاٹ سنا چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی سوچ کو لفظوں کا روپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اُس کی لغت ہے۔'' شہریار نے توصیفی نظروں سے میری جانب دیکھا ''اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی

باریک بات جسے جاننے میں مجھے مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پرکھ لی؟’’ ‘‘نہیں......... اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت لگتا یہ بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی انہونی بات بھی تو نہیں......... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر اُتارنے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گر ہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں خاص ماہر نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ جو سوچتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔’’ شہریار کہیں اور کھویا ہوا تھا ‘‘تو پھر وہ مجھ سے ٹیلی فون پر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تخلیے اور جلوت کا ہے؟’’ میں نے غور سے شہریار کو دیکھا۔ اُس کی زبان پر وہی بات آ کر رُک گئی تھی، جو خود کہیں دور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیئے۔ ‘‘ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم جس طویل گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کب تک اسی طرح جاری ہیں جیسے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے۔’’ ‘‘اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟’’ شہریار کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ غالباً وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ‘‘اُس کی گفتگو اس وقت تک مکمل تھی، جب تک میں نے شانی کی آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔’’ میں اور شہریار ایک ہی نکتے پر پہنچ رہے تھے۔ شہریار کی شیخ صاحب کو کوٹھی میں آمد کا مقصد سب کے لئے ایک کھلا راز تھا اور دوسری رات ہی سے شہریار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہریار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم آواز کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدہوش کیا کہ وہ اپنا آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی اور دھانی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہریار کی اُلجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی کیوں کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اُس روز فون پر بات کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر شہریار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر پیغام دکھائی دے ہی گیا، لہٰذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہریار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہریار نے اُسی رات وہ کسوٹی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اُس کے دل میں اتھل پتھل مچا رہی تھی اور اُس نے فون کرنے والی آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا، شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہریار کا شوقِ ملاقات بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن سماعتیں تشنہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر ایک دوسرے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پا سکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہریار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب رات کو زیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح کھل کر شہریار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہریار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ۔ لیکن شہریار نے شروع میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تاوقتیکہ اُس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں ہو گئیں۔ پھر میں شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہریار کا ہمسایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہریار نے وہ بات محسوس کر لی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک اندر

فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی رو توڑ دی۔ شہریار نے ہچکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُسے تسلی دی ”سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اختیار کیے گئے راستے کا قصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر سچ سے کتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ لیکن میں تم سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ جا کر فون اُٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔“ میں شہریار کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ نماز کے بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی سے ہی کھلی۔ دوسری جانب کوٹھی کا خانساماں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ دو مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلاف معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا تو اُسے تشویش ہوئی۔ لہٰذا اُس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں باہر نکلا تو شہریار پہلے ہی سے باہر کھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے خلا میں کیا گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا عبداللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہوتا ہے.......... ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع میں بات کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سنہرے خوابوں اور کومل جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں الفاظ کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔“

※ …… ※

لفظ رُوٹھ جاتے ہیں

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چونکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی انہونی ہو۔ ٹھیک اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہلوتہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لئے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اُس کی جانب بڑھا ”تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟“ ”نہیں۔“ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں رویوں کے اس فرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں اسے اتنی دیر لگی۔ حالانکہ اس کی اپنی نیت بھی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی۔ اور پھر جب شہریار کی پسند ان دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی۔ کیونکہ دھانی کے بقول اُس کے شہریار کے لئے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے۔ جب کہ شانی پہلی نظر ہی میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار لفظوں کا اسیر ہے۔ اُس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی سانسوں میں خون نہیں، لفظ رواں ہیں۔ اُس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جس نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر شہریار کی اُنگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند میٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے اُن دونوں کو جوڑ کر ایک ایسے نکتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک تھے۔ لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی برقرار نہیں رکھ سکی۔ وہ دو انسان، جن کے درمیان محبت کے تار جڑتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے ریڈیو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لانگ ویو، شارٹ ویو کے لہروں پر جڑے اسٹیشن پکڑ نہیں پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے دائرہ کار مختلف ہیں۔ محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا مقدر بن کر اُس انسان کی زندگی میں اُجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے ملے بنا دنیا کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ بدل بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں بعض اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لئے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔

مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک بھی ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فیصد رشتے بزرگوں کی مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں۔ ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز تر ہو جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو مہمیز دیتا ہے، لیکن شہریار کا ستا ہوا چہرہ اور اُس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اُسی لہر میں منجمد تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی سے ان کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہریار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ”پھر تم نے شانی سے کیا کہا؟“ ”میں پھٹ پڑا کہ دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے اُن کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اُسے خود بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے متاثر ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں۔ جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اُس سے متاثر ہوں۔“ مجھے شہریار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دُکھ ہوا۔ ”تمہیں اُسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اُس کا اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھر بھی گئے تو اُن کے داغ سدا جگمگاتے رہیں گے۔“ شہریار اُلجھا ہوا تھا۔ ”میں بہت دباؤ میں تھا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ بول گیا۔“ ”دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہو اصل فاتح کون ہوتا ہے۔ وہ جو شدید دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اُس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے۔ اور اُنہی چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹتے ہیں کہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہریار۔“ وہ چڑ سا گیا ”تو تم کیا چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔“ ”نہیں۔ یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری۔ تم پہلے ہی وقتی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا کرتی ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا لگ رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لئے دیر ہو جائے گی اور ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد اُنہی اَن کہے لفظوں کی صورت میں کانٹا بن کر خود ہمارے دل ہی میں چبھتا رہے گا۔ لہٰذا ہم اپنے دل کے بول اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر دیتے ہیں۔ اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس سارے عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کسک اور بدقسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے شیشے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے لئے وہ شیشہ چکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ کبھی واپس نہیں پلٹتے۔ اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھو دیتے ہیں، جو پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لئے رویوں میں حد درجہ احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔“ شہریار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ اور دوستی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمہ داری دگنی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنی ذمے داری نبھا نہیں پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور فسانے کو ایک

خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بدصورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔'' ''تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔ کہانی ختم کرنے کا ایک اُصول یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اُسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔'' شہریار نے لمبی سی آہ بھری۔ ''لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔'' ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مستعد نوکر تھوڑی دیر بعد چائے گرم کرکے میز پر سجاتے رہے تھے۔ میں دو گھونٹ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ''آج اپنی کنڈی کہاں اٹکا آئے ہو میاں۔ کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔'' میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سلیٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبیں کی شکنیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برستی ہر بارش لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی۔ چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بوجھ زیادہ دیر سہار نہیں پاتے۔ انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرا سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بسے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسرے پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہوسکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اُسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور قید خانے ہمیں کیا قید کر پاتے ہوں گے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور شاید موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہریار سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر سجائے جا رہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ذائقوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی سمجھ نہیں پایا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ اُن کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جا سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے کیا۔ تم تینوں ہی آج بے حد خاموش ہو۔'' وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں، بس کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔'' شیخ صاحب کی زبان سے بے ساختہ داد نکلی۔ ''بھئی واہ، کیا بات کہی ہے۔ خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بوندوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں سے تو بارش نے شرط باندھ رکھی ہے۔'' دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے بات ٹال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں جو ہم سے تمام گلے شکوے بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم تو ایک نعمت کی طرح ہوتا

ہے۔ کفرانِ نعمت ہو تو موسم ہم سے روٹھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دیتے۔ بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔" اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ میرا مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اُٹھتی بھاپ کے عقب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک کھلی جگہ پر پانی کا جوہڑ سا بنتا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس پانی میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیگنے سے بچاتا رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کی چھپکی اندھیرے میں مما کہیں سے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں نکل آئیں اور میں اُن کی اُنگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈوبتے دیکھ کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ "کاغذی سفینوں" کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ ہو، جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی۔ ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ چلے جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ روٹھ جاتے ہیں۔ ایک لمحہ پہلے ہی انسان جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے جو ہمیں اس بھری دنیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا ہے۔ میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں دراندازی ہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم اچانک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں؟

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لئے اُٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے ساتھ چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ "لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں لگ گیا ہے؟" شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ "پتا نہیں، لیکن عبداللہ کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی چاہتا ہے۔" وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب بڑی کرسی پر بیٹھ کر باہر برستی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رِم جھم گرتی وہ پھوار باہر کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انیکسی میں دکھائی نہیں دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر تک شہریار کا انتظار کرتا رہا، پر وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم میں باہر لان میں جلتی سفید گول بتیوں پر جگنوؤں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ضرور یہ فون شہریار کے لئے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا۔ گھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لئے چپ ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگاتار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اُٹھا ہی لیا۔ دوسری جانب اُن دونوں سے کوئی ایک بولی۔ "ہیلو.........جی میں عبداللہ بول رہا ہوں۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔" دوسری جانب کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔ "میں دھانی بول رہی ہوں۔ مجھے دراصل آپ ہی سے بات کرنی ہے۔" میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ "جی فرمائیے.........." وہ کچھ دیر تک

اپنے لفظ جوڑتی رہی۔ ”غالباً شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد چاہیے.........“ ”میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں۔“ ”شکریہ.........شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ ہی دنوں میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ ہماری شروع میں کی گئی نادانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف کر دیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں تھا۔ شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقین جانیے اس سارے معاملے میں اگر کوئی قصوروار ہے بھی، تو وہ میں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اُس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے کہیں اگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو ساری عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں، لیکن شانی کو معاف کر دیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔“ مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ گھبرا سی گئی ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ بات کچھ نازک جذبوں کی ہے۔ آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟“ ”جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں نے بھی ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شاید وہ میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت ماننے پر تیار ہی نہیں۔“ میں بے ساختہ کہہ گیا ”کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟“ دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے تاسف ہوا لیکن تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیر کی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر بھی میں نے تلافی کی کوشش کی ”معاف کیجیے گا، بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب تک پہنچ جاتے ہیں۔“ دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر دھانی نے خود کو سنبھالا۔ ”خدا کرے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے کہ بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی۔ میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی پسند بھی ہے۔ اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی وہ طاقت ہے، جو شہریار کی تمام اُلجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار رہے گا۔“ بات ختم کر کے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا واہمہ ہی نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بٹھا چکی تھی، شاید اُسی وقت جب شہریار کو اُس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا۔ لیکن شہریار نے جب اُس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کیا تو دھانی اپنے اندر چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوبصورتی سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس اس کی واحد راز دار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اُسے بھی اس طوفان کے آنے اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں والے ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ زیادہ نہ سہی پر کم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جزیرے ہی مقرر کر دینا چاہیے تھا۔ تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ انہی سوچوں میں ساری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس نہیں لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ اگر رات کو اُسے زیادہ دیر ہو گئی تو وہ اُسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جا رہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہو کر اسپتال کے لئے نکلنے کا سوچ کر ابھی انیکسی کا باغیچہ پار کر رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم سے گئے۔ وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

قریب آنے پر میں نے اُسے سلام کیا اور جواب دینے کے بعد وہ اچانک ہی اس اُلجھن کا شکار ہوگئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لئے ہمارے قدم ڈگمگا سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ''شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں ملتے ہی ضرور اُس سے بات کروں گا۔'' ''جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی.......... دراصل.......... وہ..........'' اپنے لفظوں سے زیادہ وہ خود اُلجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ''کیا شہریار نے آپ سے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟'' ''میں ناراضی سے زیادہ اسے ایک بے نام اُلجھن کہوں گا۔ شہریار اُن لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی لفظ ہوتے ہیں۔ ان کے من کے دروازے الفاظ کی چاہتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ سارے دروازے کھول ڈالے لیکن کسی اور کو اس کے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے سے ہی واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور اندر آنے والے مہمان کے فرق کی اُلجھن کا شکار ہے۔ اُسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش مکش سے ضرور باہر نکل آئے گا۔'' دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اُٹھ نہیں پائیں۔ پھر جب وہ بولی تو مجھے یوں لگا کہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ''کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے کر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر اندر سے میزبان کون؟'' پوچھنے کے بجائے کسی اور مہمان کا نام لے کر با آواز بلند صرف اُسی کو خوش آمدید کہے تو کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔'' میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکائے اس دھان پان سی سانولی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے مزید کھوجا۔ ''اندر بلانے والے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جا سکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آجانے والے مہمان بھی تو اسی تحیر اور خوشی کے ساتھ لبیک کہے جاتے ہیں۔'' اُس نے اپنی بھیگی نظر اُٹھائی۔ درد، شکوہ قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی کا افسوس۔ کیا کچھ نہیں تھا اُس ایک نظر میں.......... ''نہیں.......... کم از کم میرے معاملے میں یہ انہونی ناممکن تھی۔ میں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی لفظ ہیں۔ لیکن اُن کے دل کا راستہ بھی اُن کی نظر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر وہی نظر آیا، جسے اُن کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں شانی کے لئے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربانی ہو جائیں تو یہ میرے لئے کسی عزاز سے کم نہیں۔ کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے۔ اور چاہے انجانے ہی میں سہی، پر اب وہی شہریار کے دل کی مکیں ہے اور یہی اس کی خوشی ہے۔ اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لئے اپنی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔'' میں نے غور سے اُسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ ''یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو یک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک اُن سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی ہے؟'' ''نہیں میں نے ہی اُسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اُس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل سے رائے لینی چاہیے۔ اُس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے تو پھر اُسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا۔ کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہریار کو اپنا مان چکی تھی۔'' دھانی کے کانپتے وجود کی لرزش بڑھنے لگی۔ ''گویا معاملہ قربانی دینے کا ہے؟'' اُس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔ ''اگر یہ قربانی ہی ہے تو یہ قربانی میں اپنے جنم ہی سے دیتی چلی آ رہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت

لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہریار کی پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لئے خوب صورت خیالات اور دانش کی بیساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہو جاتا ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے۔ ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے۔ جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہریار کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا۔ لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں.......... اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہریار جیسے ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بجھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کرید کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہو کر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ کیا بدصورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹتے وقت تو ترازو اُوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹتے وقت پیمانہ یکساں رکھا جاتا ہے۔ کیوں ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لازوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے توڑ کر لانے کے دعوے صرف روپ والوں کے لئے مخصوص ہیں تو پھر ہم جیسوں کے لئے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ سہی چند اُدھ جلے انگارے کچھ مدہم جگنو ہی ٹانک دیئے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی..........؟''

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی کی آنکھ سے ٹپکا اور اس کی قدم بوسی کر گیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کب سے کھڑی ہماری ساری باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اُسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔

◆ ◆

تم بھول جاؤ گے

ان دو بہنوں کے لگا تار بہتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی حالت میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید اُلجھانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں ہمیں ان جذبوں، رشتوں اور گتھیوں کو اُسی طرح اُلجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو، میں بھی ان دونوں کو یونہی اُلجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں کبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ رکھتی ہے۔ شہریار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ دونوں بہنیں شہریار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی تو دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ بھی .... کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس تکون کے تیسرے کردار شہریار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کا ہر انسان مرد و عورت کی تخصیص کے بنا خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ ہم میں سے بعض اپنے اندر لگے شیشے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں بیرونی دنیا کے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب تک وہ خود کئی بار چونک جاتے ہیں، جب بھی ان کا واسطہ باہر لگے کسی شیشے سے پڑتا ہے۔ کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔ تبھی ہم چونک کر کہتے ہیں "ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی ...." یا "بھئی میں تو بالکل ہی 'فوٹو جینک' نہیں ہوں، بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں۔ تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے شیشے میں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کو کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں کتنے ہی بھدے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں۔ ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد رہ جاتے ہیں جو کبھی کسی نے ہمارے سراپے کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے ہیں جو کسی کی رائے کے مطابق ہم پر جچتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے جو ہماری دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا فرق ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کمرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لئے ایک دراڑ ڈال دیتی ہے۔ مجھے اُس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سنی اسی معمولی شکل و صورت والی شہزادی کی کہانی بہت یاد آ رہی تھی جس نے اپنی سلطنت کے سبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔

کاش ہماری دنیا کے بھی بیرونی آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بیچ کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے کی آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوبصورتی کو ماپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش ہم بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چند اہم معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہریار کو سوچی ہوئی آنکھیں لئے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا کیوں کہ میرے لئے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اُس کی جانب بڑھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا..........؟“ ”ہاں بس ایک دوست کی طرف رُک گیا تھا رات کو۔ اب بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ سوچا کچھ دیر تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ سلطان بابا اب کیسے ہیں؟“ ”وہ بہتر ہیں۔ لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ وہ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کس کو سزا دے رہے ہو۔ خود کو یا اُن دونوں کو..........؟“ شہریار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کرسی کی ٹیک سے ٹکا دیا۔ ”بہت اُلجھ گیا ہوں میں...... کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ ”کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دل کے دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو۔ اب جو دل کے اندر براجمان ہے، اُس کی تو قدر کرو۔“ شہریار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں دھائی کے ساتھ ہوئی ساری بات اُسے بتا دوں لیکن کسی کا بھرم رکھنا مقصود تھا۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ ان دونوں بہنوں کی پریشانی بیان کر دی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہریار کی اُلجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گی۔ اور پھر میں اس سے کس رویے کی اُمید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مہ رُخ کی ایک اُچٹتی نظر کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرا کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرا بھی عام شکل و صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین و قرار لٹا بیٹھتا، خود میں بھی تو کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر رُکا تھا۔ خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا تل تھا اور خود میرا راستہ بھی تو کسی کی صراحی دار گردن کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زُلف نے اُڑا رکھی تھی۔ خود میں بھی تو کسی کی گھنیری پلکوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا۔ پھر مجھے شہریار سے کسی بھی گلے شکوے کا کیا حق تھا۔ شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے۔ ہر جنوں کسی حسن کا اسیر ہے۔ ہر چاند کسی کی کلائی کا کنگن اور سب تارے کسی کی اوڑھنی کا آنچل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہریار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً اُن کے سامنے دوبارہ اپنی ”رہائی“ کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ”کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”جس نے یہاں دل لگا لیا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا میاں.......... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں گے۔“ سبھی ڈاکٹر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہریار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک پندرھواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھر ہی میں مجھے ایسا لگا کہ کیلنڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں۔ تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا۔ نہیں کالا نہیں یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔

مطلب یہ کہ صرف سرخ اور سبز رنگ تصویر سے اُڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں جیسے کوئی پرانے کلر ٹی وی کے چلتے چلتے رنگ اُڑ جانے پر اُسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمحاتی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے۔ لیکن ٹھیک اُسی لمحے مجھے اپنی نسوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چبھن دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور جلن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب پڑے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے انڈیلے۔ شہریار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر تحلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری روح نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے۔ پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اُٹھا کر اُن کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے چہرے پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ”کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر۔ رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟“ میں نے بات ٹالی۔ ”کچھ نہیں۔ شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں میں۔“ وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ”کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو۔ جنوں حد سے گزر جائے تو وحشت بن جاتا ہے۔“ میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہریار سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے۔ شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن اُس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لئے اُس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اُٹھا کر دیکھا سلطان بابا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہریار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک تو ہے۔ کہیں اُن کی خدمت میں کوئی کمی تو نہیں آ گئی جو شہریار یوں اُکتا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہریار نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لئے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہیے تھی اور بس........۔ چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوشگوار رہے۔ آج گزشتہ روز جیسی پھوار تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن آسمان پر آج سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ ٹکڑے ”کوکلا چھپا کی“ کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) مجھے بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھی کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دنبے ہوتے ہیں جنہیں اللہ میاں دن کے وقت نیلے آسمان پر کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوبصورت سا تصور ابھرتا تھا۔ شہریار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی بیچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پوچھ بیٹھی۔ ”عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی۔ کیا سبھی بیٹیاں اپنے بابل کے لئے اسی طرح گھلتی ہوں گی؟ ”میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لئے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں.......... مثلاً ایسا شیشے کا بہت بڑا کمرہ ہو جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں۔ برستے آسمان سے بھیگتی زمین تک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ شیشے کے ہال میں

ایک بہت بڑا سا پیانو ہو۔ اور……… ’’شانی اچانک بول اُٹھی۔ ’’اور اس پیانو پر زیبا بیگم بیٹھیں گنگنا رہی ہوں، کسی مہرباں نے آ کے میرے زندگی سجا دی، ………’’ شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب تو بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول پل بھر میں ہی خوشگوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی پروا کرنے کے لئے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد شیخ صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لئے پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اُٹھاتی میرے پیچھے چلی آئی۔ ’’عبداللہ………! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں۔ دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں۔ اور میں اُس کی آنکھیں میں آنسو تو کیا ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان موجود تھیں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی کسی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔’’ ’’جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ جانے ان آنسوؤں کی صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے کیوں کہ روتا ہوا انسان اُس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔’’ شانی کے چہرے پر چھایا تکدر صاف ہو گیا۔ ’’آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کے کلیے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں۔ کبھی امی کو یاد کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشان پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے کھو جانے پر بھی……… کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اُتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر………! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔’’ میں نے ہنس کر غور سے اُس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں اُلجھا بیٹھی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذبوں کی پتنگ کو اونچا اور زیادہ اُونچا لے جانے کی خواہش جگا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہماری شہ رگ پر پھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سنبھلتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو چکا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہریار تک اُن کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کہ ان دونوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ اُلجھ گیا۔ ’’میں………؟ میرا مطلب ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر………’’ ’’میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے۔ ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں۔ لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے۔’’ شاہانہ کی سنہری جبیں پر اپنا مدعا بیان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ کیا سبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ میں نے اُسے تسلی دی۔ ’’آپ اطمینان رکھیے۔ میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا آپ دونوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہریار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی

چاہیے............؟ دل کی گرہیں بہت مضبوطی سے بھی لگی ہوں تو اُن کا ملائم دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے۔ بعض جذبے وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پوری آنچ مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آنچ ہی سے اُتار دینے پر کچے رہ جاتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آنچ بس ایک بار ہی سلگائی جا سکتی ہے۔ دوسری مرتبہ یہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔“ شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذبوں اور رشتوں کی آنچ کی دہک ٹھیک اُس لمحے میں اس کے چمپئی سے کندن ہوتے گلابی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کر ڈاکٹروں نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیئے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی بہت رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو تو پھر سبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان کے اپنے اندر بھی بیک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا تو ایک عجیب سی خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہریار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہریار اندر ہی سے بولا۔ ”کم ان!“ دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہریار کے سوٹ کیس پر پڑی جس میں وہ اپنا سامان بھر رہا تھا۔ ”تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے............؟“ ”ہاں............! اور کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہو پا رہا تھا۔“ ”تمہارے اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟“ ”انہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جانے پر واپس گھر جا رہا ہوں۔ لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہو گی بھی یا نہیں............؟“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ ”کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟“ ”ہاں............! دونوں ہی سے فرداً فرداً بات ہوئی، آج شام کو۔“ اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کہ شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شہریار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ شانی نے اُسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب سے بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ”تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔“ شہریار کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ اُبھری۔ ”نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو............ مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین وکیل کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے۔“ ”فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں۔ تم جاؤ، انکل تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا تو کافی کے مگ سجائے جا چکے تھے۔ ماحول پر سنجیدگی طاری تھی۔ دھانی نے کافی کپس میں اُنڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صاحب بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لئے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہریار کے یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ میری بات سنتے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آس پاس کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا پائپ سلگا چکے تھے۔ اور ان کے ماتھے پر بنتی شکنیں بھی دھوئیں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں جو اس وقت اُن کے پائپ سے نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کے لب کھلے۔ ”تو کیا شہریار اسی لئے یہاں سے جا رہا ہے؟“ ”یہ بھی ایک وجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔“ شیخ صاحب نے ایک لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کسی شدید کش مکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی

جنگ تھی جس میں جیت اُن کی دو بیٹیوں میں کسی کی ہوتی، خود اُن کی اپنی ہار یقینی تھی۔ کیوں کہ یہ راز اب اُن پر بھی عیاں ہو چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور انجانے ہی میں سہی پر وہ بھی اس در کے کھلنے کے انتظار میں شہریار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ''شہریار کی اُلجھن اپنی جگہ بجا سہی .... لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی۔ شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اُس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں۔ اُس سے بس اتنا کہنا ہے کہ اس گھر کے دروازے اُس کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو سونپ دیا تھا۔ میں اُن سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے قریب پڑی آرام کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ''آ گئے وکیل صاحب! کہو کیا فیصلہ لے کر آئے ہو............؟'' ''تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا ہے............ شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اُس کے ساتھ عمر قید سنا دی جائے گی۔'' شہریار کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا بیڑیوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے کہ شانی کی خوشی اس کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لئے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے کی ہر بات بھلا کر اگر شانی کو خود اُس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔'' ''تو تم نے کیا جواب دیا؟'' ''مجھے جواب دینے کے مہلت ہی کہاں ملی۔ ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ شانی کا فون آ گیا اور کیسا ستم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا جو اس کے لئے پہلی بہن مانگ کر گئی تھی۔'' ''کیا مطلب............ ا کیا شانی نے بھی............؟'' ''ہاں اُس نے بھی صرف یہی کہنے کے لئے فون کیا تھا کہ اُس کے لئے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں۔ اور اب چونکہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے مہمان کو جان چکی ہے لہٰذا اُس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے سپنوں کی راکھ پر اپنا محل قائم کرلے۔ لہٰذا اُس نے اپنے آپ کو میرے لئے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے طور پر دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہوگا۔ دھانی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔'' میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اُٹھایا، دوسری جانب دھانی ہی تھی۔ ''یہ آپ نے کیا کیا............ کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کا خمیر بھی اسی مٹی سے اُٹھا ہے جہاں سے آپ کا جنم ہوا تھا۔ پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟'' دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ ''بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں شہریار کو پا بھی لیتی تو یہ اُن کے لئے ادھوری خوشی ہوتی کیوں کہ اُن کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی مکمل غم سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ محبت اگر دو نقطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر یہی محبت تکون کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید میں کبھی شانی کو منا ہی لوں۔ آپ نے ہمارے لئے جتنا کچھ کیا،

میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کروں گی۔ آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجئے گا، اُسے آپ کی باتیں جلد سمجھ آتی ہیں۔" فون رکھ دینے کے بعد بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہریار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہریار بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گھر سے واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ اُن کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی اُن کی آزردہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسب معمول ہنستے بولتے شہریار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں لیکن اُن دونوں کی آنکھوں میں لکھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی ہے اور اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لئے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہریار گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اُس سے پوچھا۔ "شہریار بھائی.......... آپ پھر کب آئیں گے۔ ہم سب آپ کو بہت مس کریں گے۔" وہ مسکرایا۔ "میں جلد آؤں گا۔" شانی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میں نے دھانی کو خود کو سمیٹتے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ "اسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگناتی زیبا بیگم کس سے کہیں گی کہ کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی۔" سب ہنس پڑے۔ شہریار نے شانی اور دھانی پر آخری نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گیت اس شدت سے کیوں یاد آیا جس میں محبوبہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو دہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلائے۔ پر وہ جانتی ہے کہ یہ صرف وقتی جواز ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جُدائی کی موت ہے کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جائے گا۔

تے کوں یاد ہوی میں آکھیا سی
دل دار مٹھا توں بھل ویسیں
ڈل ڈل قرآن تے ہتھ نہ رکھ
نہ قسماں چا.......... توں بھل ویسیں
کچھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر
نہ جوش دکھا توں بھل ویسیں
تیرے باجوں میں نئیں جی سکدی
نہ ظلم کما.......... توں بھل ویسیں
دلدار مٹھا.......... توں بھل ویسیں

* * *

شالیمار

کبھی کبھی پیار کھو دینے کے بعد ہمارے لئے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی محبت ''کوہ نور'' بن جاتی ہے۔ کھویا ہوا پیار ''شالی مار'' بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالی مار بن چکی تھی۔ شہریار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں چلے آئے اُن کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ کرتے ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اب بظاہر اُن کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میرے اندر کی بے چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ لمحوں کے لئے روٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن سبھی رنگ نہیں روٹھتے تھے، بس چند تھے جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صورت بیتتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو مجھے لگتا تھا جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم کھولتا سیال مادہ دوڑ رہا ہو۔ میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھونکنی بن جاتی تھیں اور میں یوں ہانپنے لگتا تھا جیسے میلوں دور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں۔ لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی منزل تک پہنچنے کے لئے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے۔ اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا لے کر بیٹھ جاتا تو وہ ضرور علاج کے مخمصے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رُکنا پڑتا اور پھر میرا کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری رُوح کو جھلسانے کے لئے ہر دم بہتے رہتے تھے۔ اور پھر خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی برف ہو جائے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوٹھی سے رُخصت ہونا تھا، اُس روز بہت سے کالے بادل ہمیں الوداع کہنے کے لئے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جانب جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برستی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اُسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان جب راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے اُن کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رُخصت کرنے کے لئے دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے۔ پھر وہی الوداع، پھر وہی رگوں کے سرے تک پھیل جانے والی اُداسی۔ جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہاں ہی سے رُخصت ہو جانا ہے تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں بچوں کو فرداً فرداً سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی اُن سے نظر نہیں ملا پائی۔ وہ کچھ دیر اُس کے پاس ٹھہر کر بولے۔ ''جن کے من کے آئینے اتنے اُجلے ہوں، اُن کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے۔ ہم جو کھو دیتے ہیں، قدرت اُس سے بہتر

ہمارے لئے پہلے سے چن رکھتی ہے۔ بس اتنا یقین رکھنا۔'' دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے کاٹ جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم اُن کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لئے استعمال کریں لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں تقریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبے تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیمر نے ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا دیا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیمر کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ جانے ان میں وہ کون سی لہر ہوگی جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی جس سے ذرا پرے میرے دل کے ساحلوں کی حق دار رہتی ہے۔ پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ان میں کوئی ایسی لہر بھی ہو جو اس ماہ وش کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرا کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا۔ ضرور یہ جھاگ اُڑاتی، مسکراتی اور شریری ہنسی ہنستی ہوئی بے باک لہریں اس لالہ رُخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک پہنچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ ''دل دریا، سمندروں ڈونگے۔'' لیکن زہرا کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ جلانے کے لئے کہاں سے آتا۔ میری پتلیوں کا یہ وضو تو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد اسٹیمر نے ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اُتار دیا جہاں کھڑی مخصوص اُونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا آخری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لئے مسجد کے دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ اُن کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور ان کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر قریباً نو دس برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے آنے کی منادی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ ان کے عقب میں کھڑا اپنی حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اُسے پکارا وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے سبھی بچوں کی روحیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، نرم، ملائم، شرمیلی اور لجیلی سی............ ہم تمام عمر اپنے بچپن والی روح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں رکھ پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے صحن میں اُن کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصارت سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسوں میں آگ بھر گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لہو میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لئے ڈگمگا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ''کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا............'' میں نے بڑی مشکل سے اپنی سلگتی سانسوں پر قابو پایا۔ ''جی............! میں ٹھیک ہوں۔ بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے۔ کچھ دیر آرام کروں گا تو سنبھل جاؤں گا۔'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ مکین نماز کے

لئے جمع ہوتے گئے۔ سبھی اپنے حلیے سے مچھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضٰی صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا نے جماعت پڑھوانے کی ذمہ داری مرتضٰی صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سبھی نمازیوں نے فرداً فرداً سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضٰی صاحب کے گھر سے ہی آچکا تھا اور اشرف المرتضٰی جواب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا، ایک جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین قتلے لکڑی کی پلیٹوں میں سجاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضٰی صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید سیلن اور نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بنا شیشے کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی جیسے کوئی ماؤتھ آرگن اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضٰی صاحب اپنے بیٹے سمیت رُخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ دیر ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے سبھی دوست تارے، گہرے نیلے آسمان پر اپنی محفل سجا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے اُن میں سے سب سے زیادہ روشن اور چمکتے تارے سے زہرا کا پوچھا۔ ''کیسی ہے وہ..........؟'' تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانکا اور ہنس کر بولا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام کرسی ڈالے ہم سے تمہاری باتیں کر رہی ہے۔ تمہارا پتا پوچھ رہی ہے۔'' جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر بہت رشک آیا۔ وہ آسمان کے چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں بھی آسمان کا ایک تارا ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی مٹیالا اور مدھم ہی سہی، ایک آوارہ تارا.......... نصف رات بیت چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں واقعی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اُس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل ایک اور ٹیلے کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں اتنی رات گئے یہ کون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ''ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے والا..........''

فجر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تو پھر اُٹھتے اُٹھتے دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے حسب معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد سلطان بابا، مرتضٰی صاحب، اشرف اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اُٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میاں..........؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''مجھے کیا ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ شاید رات کو نیند نہ آنے کی وجہ سے۔'' ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھامی۔ ''ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو..........؟'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ''فجر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے تو اچانک چکرا کر کمرے کی چوکھٹ

ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوا لیا اور تب سے ہم سب تمہارے سرہانے ہی بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں اُنڈیلی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے۔‘‘ میں حیرت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ ساری روداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح دروازے کی چوکھٹ پر ہی گر گیا تھا۔ یہاں کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں لیکن اس کے بعد سب کورا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتشی جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لمحوں کے لئے میری بصارت بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سنتے رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ’’ایک بات بتایئے......... ماضی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا پنجے گوشت تک پیوست ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی آپ کی؟‘‘ میں حکیم صاحب کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جبڑے کی کاٹ سے تو کسی طور پر بچتا رہا لیکن اُن کے پنجے میری جلد میں کئی بار پیوست ہوئے تھے۔ شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا ماس چھو گئے ہوں۔ پر میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اُسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا ویکسین کی صورت میں انجکشن بھی کر دی گئی تھی کیوں کہ میں فوجی چوکی کے مستند ڈاکٹر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کیا آپ پر جن کتوں نے حملوں کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیرِ معائنہ رکھا گیا تھا۔ اُن میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟‘‘ میں ایک بار پھر اُلجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب و غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے سبھی رُکن کتے ہی تھے اور بد قسمتی سے سبھی کتوں نے اُسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولا۔ ’’دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا۔ لہٰذا معائنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔‘‘ حکیم صاحب نے تشویش بھرا لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ ’’اوہ.........! میں سمجھا۔‘‘ سلطان بابا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ ’’کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.........؟‘‘ حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ’’مکمل بات تو تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی......... مختصراً اتنا بتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود شاید بلکہ خدانخواستہ کچھ زہریلے مادے ان کے خون میں پرورش پا چکے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرصت میں یہاں سے تیس میل دور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی دکھا دیا جائے۔ میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لئے حاضر ہے لیکن زیادہ دیر نہ کیجئے گا۔‘‘ حکیم صاحب اپنی دواؤں کی صندوقچی اُٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر بس میری فکر میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی اُن کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوکڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ’’میں آپ کا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس لئے خاموش رہا۔ آپ بے فکر رہیں میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔ ہاں لیکن اگر آپ اسی طرح روٹھے رہے تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔‘‘ میرا حربہ کارگر رہا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ’’بہت ضدی ہو۔ لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے۔ جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔‘‘ اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا

اگلا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ”ہم جن منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، اُن کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں............؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور اب مشرقی ساحل کی یہ مسجد............ سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟“ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ”کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے۔ کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھنا۔ اُمید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔“ حسبِ معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑ گئیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد گرمی اور حبس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک ڈور، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھٹکا لگا اور پتنگ آسمان میں ڈولنے لگی۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لئے دوڑتا رہا لیکن کٹی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کب آتی ہیں۔ انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور مزید اونچا اُڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا ہوا؟ کٹ گئی پتنگ............؟“ ”ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اونچی اڑائی تھی پر............“ اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔ دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی۔ سو ان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھیلیں۔ لہٰذا تمہاری پتنگ وہاں چلی گئی۔“ اشرف کچھ حیران ہوا۔ ”اچھا............ کیا بادل بھی پتنگ اُڑاتے ہیں؟“ میں مسکرایا۔ ”ہاں، بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ تب ہی تو پتنگیں اُن سے باتیں کرنے کے لئے اتنا اُونچا اُڑتی ہیں۔“ اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دور ہونے لگا۔ ”اچھا، پھر تو کوئی بات نہیں۔ بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دُھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ”میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا وہ مجھے ایک نئی پتنگ لا دیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“ ”یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟“ اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لئے آتے ہیں، کبھی کبھی اُن کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں۔ دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں۔ یہ پتنگ بھی اُسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں جن کی تعریف میں اشرف اس وقت زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا تو مرتضٰی صاحب مسجد والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آوازیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دوست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بچا کر کبھی کبھی آدھی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر سیپیاں اور گھونگے جمع کرنے آ جاتے تھے۔ لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اُسے بادل نخواستہ اُٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اُوپر مسجد میں چلا آیا۔

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضٰی صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ

جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی ان دیکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رُک سے جاتے تھے۔ رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بُری طرح جل رہا تھا۔ بے چینی اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک اِدھر اُدھر پٹختا رہا پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد رہا کہ سلطان بابا دھیرے سے میرے سرہانے سے اُٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارا نمک ملا پانی میرے چہرے پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے تھپیڑے پر میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو سر پر حجرے کی چھت کی جگہ کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحے تو میں سٹپٹا ہی گیا۔ اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھیگے ہوئے تن کو مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر گیلی ریت میں سنا ہوا تر بتر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا.........! میں یہاں کیسے پہنچا.........؟ ابھی رات کو تو میں اپنے کمرے میں ہذیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمسا رہا تھا پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا.........؟ میں ابھی حیرت کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک دور سے کچھ لوگ ہجوم کی صورت میں مجھے اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہیولے دھیرے دھیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہوئے تو سب سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ پھر ایک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی دور سے چلایا۔

”وہ رہا قاتل جناب.........!“ پھر کوئی زور سے گرجا۔ ”لپکو.........پکڑو.........قاتل جانے نہ پائے۔“ سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔

◆……◆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

قاتل

میں ہکا بکا سایوں ہی اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور حولدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک افسر گرجا ”کون ہو تم .... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی پہاڑی پر واقع مسجد میں رہتا ہوں۔“ ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا ”یہ جھوٹ بول رہا ہے، جناب۔ لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آ کر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل ہے“۔ میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے اور میرے قدموں کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟۔ کچھ ہی دیر میں ساری بستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی تھی۔ افسر کے حکم پر مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس والے زمین پر چونے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑا ترچھا جسم پڑا ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چونے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زوردار ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ تیئس، چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں موندے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ کر سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگ رہی تھی جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی دیئے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ لپک کر میرے قریب آئے اور میرے ہاتھ ٹٹول کر کہنے لگے ”یہ ہتھکڑیاں کیسے عبداللہ میاں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟“ اتنے میں ایک سرکاری جیپ ساحل پر نمودار ہوئی اور سارے پولیس والے ہوشیار اور مؤدب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹایا۔ ”اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ۔ ایس۔ پی صاحب آ رہے ہیں“۔ ایس۔ پی صاحب کے قریب آتے ہی سب پولیس والوں نے کھٹا کھٹ سیلوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا اور غور سے میری طرف دیکھ کر بولا ”ہونہہ .... تو یہ ہے وہ لڑکا؟“ سلطان بابا نے کھنکار کر ایس۔ پی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”کیا جرم کیا ہے عبداللہ میاں نے .... آپ نے اسے ہتھکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟ افسر نے غور سے سلطان بابا کو دیکھا ”یہ آپ کا بیٹا ہے؟“ ”بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں .... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہوتے“۔ ایس۔ پی نے غور سے بابا کو دیکھا ”خوب .... اور آپ کون ہیں؟“ ”ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک ہی راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اُوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں گے میاں“۔ افسر نے گہری سانس لی، لیکن فی

الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے ہمیں۔ بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کے آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ اُوپر والی مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟ سلطان بابا نے لمبا سانس لیا ''میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے میں ہی سوتا چھوڑ گیا تھا''۔ ایس پی نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا، لیکن آپ کا یہ سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔'' پولیس افسر نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیپ کی طرف چل پڑے۔ مرتضیٰ صاحب اتنے پریشان تھے کہ اُن سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پلٹ کر سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے حکیم صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ اُن کے اندر جانے کتنے طوفان اُمڈ رہے ہیں لیکن وہ پولیس کے ڈر سے کچھ بول نہیں پا رہے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے میری نظر آخری بار اُس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے قتل کا داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جنون اب اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ بستی والے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اُڑاتی جیپ تیزی سے ساحل سے دُور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر دھندلا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی جس پر برسوں پہلے کیا گیا پیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک زنگ آلود بورڈ جھول رہا تھا، جس پر لکھے لفظ بغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ''پولیس تھانہ، تحصیل ماہی''۔ اور تب تک جیپ تھانے کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ ایس۔ پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار نے مجھ سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب کھڑا رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس۔ پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھتے ہیں اور یہاں صرف اس قتل کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیونکہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اُس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں سے تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اس تمام واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلق سا تھا جیسے پولیس قتل کے الزام میں مجھے نہیں .... کسی بیگانے کو پکڑ کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آ گئے اور تھانے دار اور چند مؤدب حوالدار اُن کے آس پاس اکڑ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ اُن کا نام رحمٰن تھا۔ ایس پی نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کش لے کر دھوئیں کا مرغولہ فضا میں بکھیرا اور دھوئیں کی اس نیلگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ''ہونہہ........ تو عبداللہ نام ہے تمہارا۔ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟ میں نے مختصراً انہیں تفصیل بتائی۔ کتنا پڑھے لکھے ہو؟'' میرا مطلب ہے مدرسے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟'' ''جی مدرسے کی تو کوئی سند نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں''۔ میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی کیوں کہ شاید میری صاف گفتگو سے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب علم سمجھ بیٹھے تھے۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے

تھے، جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں تم نے اُسے پہلی بار کب دیکھا تھا؟'' ''میں نے پہلی بار اُسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے حجرے سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر کیسے رہ گئے؟ تھانے دار سے صبر نہیں ہو سکا اور وہ کڑک کر بولا۔ ''کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ سیدھی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟'' ایس پی نے ہاتھ اُٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا ہے۔ دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آ جائے گی تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا، لیکن تب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا چلا کہ تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا''۔ ''میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں تو بھی آپ کے اختیار میں ہوں، جو سزا مقرر ہوگی، مجھے قبول ہے۔ رحمٰن صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ جانے کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی چبھتی ہوئی ہوتی ہے۔ تب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے رُوح میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آ کر بتایا کہ بستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے کمرے میں بیٹھانے کو کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک سپاہی کو میری نگرانی پر مامور رہنے دیا گیا۔ البتہ میرے ہاتھ اب بھی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا اور میری نسوں میں چنگاریاں بھر گیا۔ سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو دیکھا اور پھر مجھے ڈولتے دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پیلی دیوار پر کچھ عجیب سے عفریت نما سائے اُبھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی صدیوں بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دھیرے دھیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ میں اُس وقت حوالات کے سنگی سل نما چبوترے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ ایک ڈاکٹر اور ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حوالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آتی دھوپ کے زاویے اور کندن رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے دبے پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روزِ قیامت جب ہم دوبارہ جگائے جائیں گے تو ہمیں یوں لگے گا جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چند دنوں سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے اور جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا تو مجھے بالکل اُسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پل کے لیے ہی آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا ''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ بہتر ہوں۔ بس سر میں شدید درد ہے''۔

''ہوں ...... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشارِ خون، خون کا دباؤ''۔ ''جی سمجھ گیا.............''

رحمٰن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسبِ معمول اُن کی انگلیوں کے درمیان سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ''تمہیں یہ بیماری کب سے ہے؟''

میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، کیونکہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھامی۔ ٹیٹنس (Tetanus) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ میرے خدشات کے مطابق (Rabies) ریبیز کا کیس نہ ہو، لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں”۔ حکیم صاحب نے کچھ کہنے کی کوشش کی، جناب یہ جنون کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے ہماری طب کی زبان میں اسے ”سگ گزیدگی“ بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اسے ہیولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اُس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے، یعنی کہ ڈاکٹر کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی، وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ”ہاں ہاں.......... یہی ساری علامات ہوتی ہیں، ریبیز کی بھی۔ لیکن میں نے آج ریبیز کو زندہ بچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب کہ یہ نوجوان تو بائیس روز گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔“ بحث طول پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں۔ لہٰذا اب رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔ فی الحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب اور جدید میڈیسن (Allopathy) ٹرین کی دو ایسی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل بھی ایک ہوتی ہے لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ حوالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی طاق میں رکھا دیا جلا دیا، جو سلاخوں سے پرے اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی حوالات تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔ کچھ دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حوالات میں باقی رہ گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی۔ ”یہ کیسا مقدر لکھوا کر لائے ہو میاں۔ کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنون ہی تمہاری تقدیر نہ ہو“۔ میں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔ اس فرزنگی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنون کسی کے لیے باعث نقصان نہ ہو“۔ اتنے میں سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ”لاک اپ“ میں بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے، لہٰذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حوالات کی سلاخوں پر بڑا سا لوہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے اسے ”لاک اپ“ بنا دیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل بستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ ہیں تھانے کے آس پاس رات گزارنے کی دُھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رحمٰن صاحب واپس شہر جا چکے ہیں اور اب وہ صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے ریمانڈ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھ لیا گیا تھا، لہٰذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر میں صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا جنوں اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس تھا۔ میں تو وہ بدنصیب دیوانہ تھا، جو ناصح کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھسک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور صبح سے ہوئے اب تک کے واقعات کا ازسرِنو جائزہ لینے لگا۔ اب تک کی کڑیاں کچھ یوں جڑتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر

اسے بھی زہر کر چکا تھا اور اب میرے اندر اپنی بھیڑیوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے کسی بھی لمحے میں خود سے بیگانہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا، لیکن اس وقت خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہٰذا فوراً حکیم صاحب کو بلوا لیا گیا اور اُن کی میرے حلق میں ٹپکائی گئی دوا نے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا، لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر مسجد سے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو ساحل پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو؟ کیونکہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میں خود اپنے قابو میں ہوتا تھا، لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اُس کی جان لی تھی تو کیا وہ وہاں تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کے سنپولیے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اُڑ اُڑ کے میرے چہرے، ماتھے اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جو مجنوں جس قدر خاک آلود ہو، اُتنا ہی گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور سلور کی ایک چھوٹی سی گلاسی لیے نمودار ہوا۔ ”لے بھئی مولوی، چائے پی لی۔ بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون تیرے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دوران تو نے اس لڑکی کی جان لے لی۔ اب اللہ جانے سچ کیا ہے.........؟“ میں نے سنتری سے پوچھا۔ ”وہ لڑکی کون تھی جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟“ سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چائے کی دوسری گلاسی لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ”کیا بھلا سا نام تھا، اس بے چاری کا ہاں.........لیلیٰ.........یہی نام تھا۔ سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اُسی کے مالک ریحان کی منگیتر بھی تھی۔ ویسے ریحان کا نام یہاں بھی سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے۔ وہاں شہر میں اس کی بیسیوں فیکٹریاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزیر اس کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ہمارے ایس پی صاحب بھی اطلاع ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں“۔ میں نے سنتری کو ٹٹولا ”لیکن وہ شہر سے اتنی دُور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی تنہا“۔ ”پتا نہیں۔ سنا ہے اُس کی اور ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے بھی ان دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آئے ہوں“۔ سنتری کی بات سنتے ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اُس نے بھی کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں اکثر آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اُڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحب اور میم صاحبہ تو نہیں؟ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ”ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چل گیا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے، لیکن اُس کے گلے پر خراشیں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ اُوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی یا پھر اُسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی مہندی بھی اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رُخصتی تھی۔“ سنتری کی

بات سن کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اُٹھا کر واپس جا چکا تھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں سی بنا دی تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات تھی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں''۔

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں بھی اُبھریں اور کچھ لوگوں کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی، وہ تیز تیز چلتا ہوا، میری طرف آیا۔ ''چلو حافظ جی.......... تمہاری ملاقات آئی ہے''۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور ملنے آیا ہوتا تو اُسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا ''مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟'' سنتری نے حوالات کا تالا کھولا۔ ''ریحان صاحب آئے ہیں''۔ میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا.......... ''ریحان.......... اُس لڑکی کا منگیتر..........؟'' میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کوئی شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اُس نے پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں ہلکے سے کھنکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔

* * *

قفس اور جنوں

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے سامنے اس وقت وہ شخص کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر پر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیس اور سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، کف لنکس، کوٹ اور پتلون کی گھٹنوں لگا کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ چمکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور سے اپنا ہر دوسرا پیراہن خریدا کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا مونوگرام جگمگا رہا تھا، لیکن اُس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت لٹے ابھی چوبیں گھنٹے بھی نہ ہوئے، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس تمام تر اہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ کلین شیو چہرہ، جس پر نسوانیت کی نازک سی جھلک دِکھتی تھی، کس قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ''تو تم ہو عبداللہ.........'' میں چپ رہا ''مجھے بتایا گیا کہ تم کسی اعصابی بیماری کا شکار ہو''۔ ''مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین کر لیں کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی منگیتر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔'' ریحان کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ لگتا تھا جیسے صدمے سے اُس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی اپنے آپ سے بڑبڑاہٹ کرتا ہے۔ ''جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے بھلا کیا حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی''۔

اتنے میں باہر کسی سرکاری جیپ کے ہوٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس پی رحمٰن صاحب اپنے سر سے پولیس والی ٹوپی اُتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ''معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب......... راستے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر رُکنا پڑا۔'' ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔ ''اٹس او کے۔ آپ نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے''۔ ''اوہ ہاں......... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوعہ پر ملی کچھ چیزیں دکھانا تھیں۔ اُن کی شناخت اور پولیس کو مطلوب معلومات کے لیے آپ کو میرے ساتھ جائے واردات تک چلنا ہوگا''۔ ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا دروازہ لکڑی کی چوکھٹ سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکھٹے پر پڑی چق بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ انہی اُدھڑے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ

مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سلگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل جھلک دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اُس کی یہ حالت کر دی تھی۔ ایس پی کی آواز گونجی ”آپ کے خیال میں لیلیٰ اتنی رات گئے اس ویرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟“۔ ”وہ ہمارا پسندیدہ تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلیٰ اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلیٰ کو پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی گہما گہمی اور ہجوم میں یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہٰذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلیٰ کو اپنی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہو سکتا ہے دل گھبرایا ہو تو اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی ہمیں مخالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا تو میں لیلیٰ کو کہہ دیتا تھا اور وہ با آسانی وہاں تک آ جاتی تھی۔ البتہ رات کو تنہا آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔“ رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا ”لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واردات کے مقام سے ہمیں بیک وقت دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus) ہے، جو لیلیٰ کے استعمال میں تھی، اور جائے واردات ہی پر کھڑی تھی، لیکن ایک دوسری گاڑی بھی آئی ضرور تھی، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی، کار یا جیپ بھی ہو سکتی ہے۔“ ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے ”لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلیٰ کی کسی دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی اُسی شام وہاں آئی ہو، لیکن لیلیٰ کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر سے لوگ ہوا خوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلیٰ وہاں آتے تھے تو ہم سے پہلے ہی کوئی خاندان، کوئی جوڑا یا منچلے نوجوان وہاں پکنک مناتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھ جاتے تھے“۔

رحمٰن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ ”ہاں.........ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ چھوٹی گاڑی لیلیٰ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا عملہ بستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایک تو وہ پوائنٹ بستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ پھر اس بستی کے لوگ سرِ شام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی ہیں۔ جبکہ لیلیٰ کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہر حال، فی الحال تو تمام اشارے اُسی نوجوان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے“۔

ریحان صاحب اور رحمٰن صاحب کمرے سے باہر نکلے۔ ریحان کی نظر مجھ سے ملی۔ مجھے اس جوانِ رعنا کے حوصلے اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اُس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں گے، لیکن چہرے پر سمندر جیسا سکوت طاری تھا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم شور سا اُٹھا اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذوب شخص کر پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر بند کر دیا۔ ملنگ غصے میں اول فول بکتا رہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگوں کو اینٹ یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پر آج تو اس نے حد ہی کر دی اور پتھر مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار ایس پی صاحب کے ساتھ جائے واردات کی طرف نکل چکے تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ مجذوب بکتا جھکتا وہیں سلاخوں کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا

”تو...... تو یہاں کیا کر رہا ہے......؟“ میں گڑبڑا سا گیا۔ ”میں...... میں بھی قیدی ہوں“۔ ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”قیدی...... ہونہہ...... تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔ یہ سلاخیں تو تو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں“۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے پولیس والوں کو بری بری گالیاں دینے والا مجذوب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنتری سلاخوں کے پاس سے گزرا اور ہنس کر بولا ”اس کی باتوں میں نہ آنا عبداللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ“ کتنی عجیب بات تھی۔ اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تھا اور دوسرا دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اُچھل کر بالکل میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ”یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں......“۔ میں زور سے چونکا، گویا اس ملنگ کو بھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”سچ بتا......؟ کیوں مارا اسے...... تو اور کتنے خون کرے گا......؟“ میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنونی ہو گیا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے...... یوں دربدر بھٹکنے سے تو اسے پا لے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ تیرا مقدر ہی یہ سدا کی دربدری ہے۔ تو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی انسان تجھے بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو نبھا نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا پائے گا۔ صرف نام ہی عبداللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں“۔ مجذوب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا اور میرے اندر بیک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے گم صم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ”تو ایسے نہیں مانے گا...... نہ مان...... کھاتا رہ یونہی دربدر کی ٹھوکریں۔ ایک روز یونہی سولی پر چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خدا“۔ ملنگ مجھ سے روٹھ کر دوبارہ دُور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے بگڑنے لگی۔ وہی چنگاری میرے دماغ سے نکلی اور میرے سارے جسم کو جھلسا گئی۔ سامنے بیٹھا مجذوب ایک بھیڑیے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر مختلف آلات لیے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ، سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ”تم ٹھیک تو ہو...... تمہیں بخار تو نہیں رہتا، ہر وقت تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے ہوتے ہیں؟“ سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں......؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں پڑ جاتے اچانک؟ میں نے بمشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب ہوتا ہوں جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینیئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں مدھم کرنے کو کہا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی دینے والے ہیولوں، بے یقینی، پُرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ ایس۔ پی رحمٰن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ اسے واپس جیل لے جا سکتے ہیں۔ سینیئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہ داری سے ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے، جہاں پہلے سے رحمٰن صاحب تھانے دار سمیت

ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید بات صرف قید یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد وضوابط ہی تو ہیں جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔ رُدسو نے سچ ہی کہا تھا کہ ''ہم بظاہر آزاد ہوتے ہیں، لیکن تمام عمر اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں''۔ رحمٰن صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے ''بظاہر عجیب سی بات لگتی ہے لیکن سائنس اور ایلوپیتھی کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم روزانہ سینکڑوں پرانی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج بن کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا۔ یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی ترتیب بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی جسم کے اندر ہمہ وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے جس میں اس نظام کے تحت بہنے والے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان مادوں میں کسی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں بیماری کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے مرکب شامل ملے ہیں جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کاٹے کی مکمل ویکسین بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ اینٹی ٹیٹنیس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیسا اثر ہے، جواب تک باقی ہے۔ میرے لیے یہ میڈیکل ہسٹری میں ایک نئی دریافت ہے.......اسے ریبیز بھی نہیں ہے پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہ تک نہیں پہنچے تو اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے''۔ میرے ذہن میں فوراً ملنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصالِ صنم.......... میں بے اختیار ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا ''میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب.........'' ڈاکٹر سمیت رحمٰن صاحب اور تھانے دار بھی اُچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے سامنے مرض کی نوعیت بتا کر اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر اُن تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ میں یہ ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا ''تم انگریزی جانتے ہو؟'' میں نے اُردو میں جواب دیا ''کچھ شدھ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔ مکمل پاگل پن میں اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس.........؟ رحمٰن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا ''دیکھو نوجوان.......... ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو اور مجھے تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ مجھے یقین ہے میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور حوصلے سے جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس''

ایک اچھے طبیب کی طرح سنیئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس۔ پی صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگاتار معائنے کے لیے شہر کے اس بڑے اسپتال میں لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جیپ کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے ہتھکڑی لے کر میرے جانب لپکے لیکن رحمٰن صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا۔ ''نہیں.......... اس کی ضرورت نہیں.......... عبداللہ

کو میں اپنی گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے پیچھے چلتے رہو۔” حوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا “بہتر جناب” اور رحمٰن صاحب مجھے لیے اپنی سرکاری جیپ کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح وسیع اور جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگمگاتے شہر کو چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے داہنی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی “تحصیل ماہی” کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مرتضیٰ صاحب نے شہر سے بستی کا فاصلہ تقریبا30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمٰن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور اُن کا ڈرائیور اور گارڈ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر گم صم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر آغاز کا انجام “فنا” ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمٰن صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔ ڈرائیور نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے بنا بولے “اُس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو تم نے ٹھیک طرح سے مجھے بتایا کیوں نہیں؟” “آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے کی کوئی سند نہیں ہے۔” رحمٰن صاحب ہنس پڑے۔ “اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟” “انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے میں نے..........” وہ اُچھل ہی تو پڑے۔ “واقعی..........؟ تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان ویرانوں کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے”۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا “اِسے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی جاتی۔” رحمٰن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور ان کے اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا لیکن تیر ایک بار پھر کمان سے نکل چکا تھا۔ “خوب.........میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ لیکن اُسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو”۔ “میری گزارش ہے کہ یہ حکم کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک ممکنہ مجرم کی حیثیت میں آپ کا قیدی ہوں اور میرا ذہن بہت جگہوں پر بٹا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے۔ ان کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔” رحمٰن صاحب نے دھواں اُگلا “وہ بزرگ بھی تمہاری طرح ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ بہر حال اسپتال آنے سے پہلے میں بستی میں ہی تھا، تفتیش کے لیے۔ میری اُن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔” میں نے تشکر بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ “شکریہ.........آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔ رحمٰن صاحب ہنس پڑے۔ یہ لقب ہے یا الزام۔ چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج بستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ اگر وہ سچ ہوا تو پورے کیس کا رُخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو، وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسری عورت کسی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہے، اس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا لیکن اُس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی میم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر بستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے راستے ہی میں اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا

لیکن اُسی لمحے مسجد سے اُس کے باپ نے نکل کر اُسے آواز دے کر واپس بلا لیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔ بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر گئی ہیں اور ان کے پیچھے اُس نے ایک دوسری گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے، جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب بچے کو گھر لے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتہ چلا"۔ ایس پی صاحب ضرور اشرف کی بات کر رہے تھے، لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمٰن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں گم تھے کہ حوالات کا گیٹ آپہنچا۔

ابھی میں ایس۔ پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا "جناب پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آ گئی ہے۔ لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھرونچیں اور خراشیں آئی تھیں، وہ اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنجوں کے نشانات تھے"۔ محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ رحمٰن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا، اُمید کا چراغ، ایک جھونکے ہی سے بجھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنجوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

❀……❀

لہو کا لباس

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی درز سے اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان بنائے جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا یہ قید پورے جسم کے ساتھ ساتھ ہماری نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں نے حوالات میں آتے ہی اپنے ہم درد سنتری سے ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا ”وہ پاگل مجنوں........ اُسے تو شام ہی کو ایس۔ پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا“۔ آج شام جب ایس۔ پی صاحب تھانے آئے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا۔ ”جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا۔ آپ اجازت دیں تو میں کوچ کر جاؤں“۔ صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ میں مایوس ہو گیا۔ میں نے اسماعیل سے درخواست کی ”اسماعیل........ تم میرا ایک کام کرو گے؟“ اسماعیل جلدی سے بولا ”ہاں جی........ ضرور........ کیوں نہیں“۔ ”کیا تم کل صبح کہیں سے اس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اُسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟ حافظ جی یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اُس کی باتوں میں نہ آنا۔“ میں نے سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے نہیں کروائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسماعیل ایک دم گھبرا سا گیا ”ارے ارے........ یہ کیا........ نہ عبداللہ........ نہ........ ایسے نہیں روتے........ تم تو بہت بہادر لڑکے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اُسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر پکڑ لاؤں گا۔ چلو اب آنکھیں پونچھ لو“۔ وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا چاہتے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جس کو بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرا کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے کہہ کر زہرہ کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے مکمل ہوش و حواس میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہو گی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اُس مجذوب کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی کہ ”نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہو گا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق دار ٹھہرے گا“۔ پتہ نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، اُمید کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لاحاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشق مجازی کی چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق حقیقی کی مکمل بھڑکتی

آگ......... کیا میں یونہی خواہ مخواہ اِدھر اُدھر سر پٹک رہا تھا؟ انہی سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے سے روکے رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جو دھماکے ہو رہے تھے، اُن کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، اس درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے ہاتھ پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی اُنگلیاں مُڑ کر تقریباً بیچ ہی گئیں۔ اسی اثناء میں اسماعیل چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا۔ عبداللہ......... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں.........؟" میں نے بمشکل اپنے لب کھولے۔ "کچھ نہیں......... تم بس جا کر اُسے ڈھونڈ لاؤ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے۔ تم اُسے لے آؤ........."۔ اسماعیل اُلٹے پاؤں باہر بھاگا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے اپنے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں۔ جبڑے کی اینٹھن نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھایا اور اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ وہ چند لمحوں بعد ہی وہ کڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ ہی دیر میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن وہ ملنگ دوبارہ اُسے کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھڑے یا چبوترے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھل گئی تھی، لیکن میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا تھا۔ اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اُٹھا لیا، جسے میں نے اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا "یہ روگ کہاں سے لگا لیا اپنی جوانی کو بابو......... ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں"۔ پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات یاد آئی۔ "ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آ کر تمہیں بتاؤں گا۔ پر یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے بعد تمہارہ گیا تھا، تب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ "اُس سے کہو مشرق کو دیکھے......... مشرق کو دیکھے"۔ جانے مشرق میں کیا ہے؟ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی سلاخیں اور دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور اس میں چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس......... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس اُمید سے دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آ جائے، لیکن سب بے سود رہا۔

کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضٰی صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں برسوں کے بیمار اور نڈھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو اُن کی حالت بہتر ہو جاتی لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ "کاش" لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضٰی صاحب مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن سلطان بابا چپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔ آخر کار مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا۔ "آپ

کچھ کہتے کیوں نہیں.......... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔" "کیا کہوں میاں.......... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سرا چھوٹ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر گہری سانس لے کر بولے "وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے۔ اگر اُس کا مقصد اشارہ دینا تھا تو وہ دے کر چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا"۔ میں چاہ کر بھی ان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اُس کی تنبیہہ سچ ثابت ہوئی تو پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرا کو پیغام بھیجنے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں باہر ہلچل سی مچی۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک اَن ہونی تھی۔ عام حالات میں ایس پی جیسا بڑا افسر شاید سال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں اثر ورسوخ کی وجہ سے اس تھانے کے در و دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ ساری گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی مہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چمکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے در و دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی ہو رہی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیلٹ کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ نئے سوراخ کر کے اور بیلٹ کا فیتہ سانس گھٹنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بکل قلعی سے جگمگا رہے تھے اور جوتے پالش سے چمکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی حجامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رنگروٹ صبح سویرے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اُڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس۔ پی صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے میں بٹھا دیا تھا۔ آج ایس پی کا رُخ خلافِ معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آ کر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولے "آئی جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔" رحمٰن صاحب پشیمانی سے بولے "عجیب لڑکے ہو تم بھی۔ تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم.......... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔" میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی "کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی..........؟" وہ چونکے "نہیں.......... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا"۔ "لیکن میں نے تو اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" "ہاں، جانتا ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے اُن سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔" تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ رحمٰن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانے دار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمٰن صاحب بہت اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ "یقین جانیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی کئی بار حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناطہ بتا دیتے۔ وہ میرے نہایت قابلِ احترام اُستاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی میں اُنہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اُنہی کی وجہ سے ہوں اور آج صبح سویرے جب اُن کی کال آئی تو یقین جانیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو

جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ سلطان بابا بولے" آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو شاید نصیر صاحب تک میری عرض داشت کبھی نہ ہوتی۔ اس جیسے نہ جانے اور کتنے الزام کتنے کلنگ لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے ہم، لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا، لہٰذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ اُمید ہے کہ آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے۔" رحمٰن صاحب گڑبڑا کر بولے"نہیں.......... ہرگز نہیں.......... یقین جانیے، یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی تکلیف جھیلے تو اُسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی مچلکہ بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جا سکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، اسی علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی مچلکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد وضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں"۔

مرتضٰی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک مچلکہ بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمٰن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم پر خراشوں کے ناخن کے کھرونچوں کے جو نشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں کے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اُس دوسری عورت کا بتایا تھا، اُس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے، لیکن چونکہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہر حال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن رحمٰن صاحب پُر اُمید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رُخصت کرنے خود تھانے کے صحن تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُن کی یہ خواہش بھی کار فرما تھی کہ بستی سے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمٰن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس۔ پی کی گاڑی سے اُترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا سہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے مچھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہٰذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رُخصت ہوا، وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ "پتا ہے.......... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے، شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے۔ پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے، اُس جگہ بیٹھ کر"۔ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بدنصیب کو تو

اب تمام عمر رونا تھا۔‘‘ اور پتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا......... یہ تم نے اچھا نہیں کیا......... پر طالب جی......... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں‘‘۔ میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا۔ لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدا تو مجھے اتنا سمجھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب کبھی وہاں تنہا آتا تھا تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے آس پاس عملہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، اُن میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہٰذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگاتار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر ٹیس پکڑ لیتے ہیں۔ جب وہ تاریخیں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی، اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کسک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ اُن کے اس کلیے کی رُو سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچالی لیکن ان درندوں کے خون خوار جبڑوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اُسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مہینے بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات نسلیں حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور کچی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراب......... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہ بنتی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمسایا، لیکن اُس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی، اُس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے......... کہاں.........؟ وہ بیک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میری جانب گھور رہی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کپکپی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے

ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اُسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایس پی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سُنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رُخ بدلا اور آواز غائب ہوگئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دُور اُسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاڑی کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دُور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے ملگجے سرخ اُجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

* * *

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

آدھا چہرہ

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اُسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پس منظر میں ساحل پر پھیلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں تو میں اتنی دُور سے شاید اُس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاڑی کے اِردگرد روشنی کا ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اُس کے چہرے کی دھیمی سی لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آئی تھی۔ نہ جانے اُس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پسینے کی ایک لہر سی دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں اُس جانب آتے ہوئے دوڑتے وقت اپنے قدموں کی چاپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اسی آواز نے اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں زور سے چیخا ”میری بات سنیے.........رُک جایئے“۔ لیکن وہ بھلا کہاں رُکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک تو میں اپنی پھولی سانسوں پر قابو ہی نہیں پا سکا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ اور اب صرف اس کے پہیوں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لیلیٰ نیچے گری تھی یا اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا تا کہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی، اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا لیکن بھلا ہو قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا جو لہراتے وقت میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اُسی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے کبھی بھی اونچائی کے خوف (Height Phobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا۔ لیکن آج میں نہ جانے یہ اُونچائی کیوں جھیل نہیں پا رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اُونچی جگہ پر معلق یا پھر اُونچائی سے خود کو نیچے گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے ریبیز کی ایک علامت ”اُونچائی کا خوف“ بھی بتائی تھی۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکتی نظر آئی۔ میں نے اُسے اُٹھایا تو سرخ رنگ کی ایک پتلی نوک دار ہیل تھی۔ اوہ گویا وہ پُراسرار عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑ گئی تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں رحمٰن صاحب اور اُن کی ٹیم کے ہمراہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی اب رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ”حیرت ہے.........اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم دربدر بھٹک رہے ہیں تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں اُلجھ کر اور ہر طرف جال بچھا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ جب کہ سب سے اہم لیکن غیر متوقع جگہ

پرنا کہ لکھوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے تو وہ واپس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔" رحمٰن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور عورت کی شبیہہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا۔ البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہرحال، رحمٰن صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں ذور ریت پر بیٹھا، تھانے دار کو اپنے محرر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ قوسے کا نقشہ پھر سے بنا رہے تھے۔ تھانے دار کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ محرر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا "میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی.......... مشرق کی سمت سے.......... سمجھ نہیں آتا کیا..........؟" اور ٹھیک اُسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی۔ ہاں اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اُس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اُس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ "جانتے ہو.......... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور وہ کیا کہتی ہے، سائنس کی ڈائی پولر تھیوری آف گریوٹی.......... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت قبول ہو رہی ہے عبداللہ.......... جیتے رہو"۔ مجھے دعا دیتے وقت اُن کے آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محرر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں تو فوراً بستی کے پوسٹ آفس سے ماہی تحصیل تھانے کے نمبر پر فون کر کے بتا دوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب عملہ وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

اگلی صبح رحمٰن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اُس عورت کا خاکہ بنوا دوں۔ میں بستی سے چلنے والی واحد قدیم سی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے ان شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھلیانوں اور میدانوں میں مٹرگشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فنکار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے مجھے اپنے ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا کیبن تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا وائرلیس نظام اور ایک قدیم سا مٹیالے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اُوپر ایک چھوٹا سا زنگ آلود تالا لگا تھا۔ تالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فنکار مصور کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اُس رات اُس عورت کے چہرے کا

صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ ملگجے اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور مکمل اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہٰذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اُس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پنسل کے ذریعے اسکیچ کی صورت میں اُتار رہا تھا۔ اچانک مصور نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا تھا، اُس کے ہٹتے ہی میں نے دیکھا، اُس کے پیچھے دیوار پر میخوں کی مدد سے جھولتا ہوا ملک کا ایک پرانا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحیم پور، رحمٰن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی......... میں نقشے پر خیالی انگلی سے اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میں نے جلدی میں دو تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا، اُسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اُسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑے اُس کے کینوس کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں ایک پینسل نکالی اور اس کی مدد سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شبیہ اس مٹیالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی وہ پہلے الف اور پھر لہ تک آ کر رُک گئی تھی یعنی اگر مکمل لفظ جوڑا جاتا تو اللہ کا الہ بنتا تھا یعنی وہ حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ''اللہ'' کا نام بن جاتا۔ میرے دل و دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھوانا چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اُسی وقت طے ہو چکا تھا، جب عبداللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر چکا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اُس کی تصویر کو دیکھ کر اپنا حتمی فیصلہ سناؤں، لیکن اس وقت میرے حواس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جواب پانی ہو چکی تھی۔ میں نے خاکے پر نظر ڈالی۔ مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی ایک خاکہ میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس و پیش کے ہو بہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے حوالے کر دیا اور ایک بار پھر اس آدھے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اُس عورت سے پہلے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اُسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے بستی پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا تو دُور آسمان پر میں نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اُڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی میں سرشار پتنگ کو ڈھیل دیئے جا رہا تھا اور اُس کی دھانی پتنگ، دُور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے سمندر کے اُوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے چونک کر دُور ٹیلے کی جانب دیکھا تو ریحان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی ریحان نے لیلیٰ کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسبِ معمول سمندر کی طرف چہرہ کیے گم صم سا کھڑا تھا۔ آج اُس کے ساتھ اُس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اُس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ تھانے والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو پینسٹھ سے ستر برس کے پیٹے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ میں

اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا وہ گفتگو کے معاملے میں دو انتہاؤں پر تھے۔ یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش......... ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا۔ ''اوہ......... تم ہو......... مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا......... پولیس کی غلط فہمی دُور ہو گئی.........'' میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا۔ ''مجھے پولیس کی کبھی اتنی پرواہ رہی بھی نہیں، لیکن کیا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔'' ریحان اُسی طرح خلا میں گھورتا رہا۔ ''جو خود اپنی ذات ہی سے بدگمان ہو، اُسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اُسے اپنی تنہائی میں مداخلت بھی شاید پسند نہیں آئی تھی۔ اتنے میں اُس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا اور ریحان سے بولا۔ ''چھوٹے صاحب......... سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔'' ریحان کی آواز درشت تھی۔ ''کچھ دیر میں چلتے ہیں.........'' لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ''نہیں چھوٹے صاحب......... سورج ڈھل جائے گا......... ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے.........'' ریحان نے کڑی نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا لیکن باول نخواستہ اُس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر ریحان کا یوں بنا چوں چراں کیے چل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی۔ ایسی ہدایات تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ ریحان کے بارے میں مجھے جتنا کچھ پتا چلا تھا۔ اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہٰذا اُس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اس کی زندگی میں بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پت جھڑ کی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں؟ میں خود اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے بنتا ہے تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھوں کہ وہ اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اُس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرتضیٰ صاحب میرے اور سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے تو اشرف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو اشارہ کیا اور ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اُس سے پوچھا کہ کیا اس کے پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ناں......... وہ تو میم صاحبہ کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالانکہ میرے سامنے کئی مرتبہ میم صاحب نے اُن کو بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اُڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک لے کر جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رُکتے ہی نہیں تھے۔'' میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھایا۔ ''ہاں، ہاں......... یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔'' کچھ گتھیاں ایک جانب سے اُلجھ رہی ہوتی ہیں تو دوسرے سرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمٰن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فون کر کے گزارش کی کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سینئر ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے درمیانی وقفے میں روز بروز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے لیلیٰ کے قتل کی گتھی

سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھے اُن کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمٰن صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا ”لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..........پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل جنوں کی منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے..........؟ بہر حال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..........اور یہی میرا فرض بھی ہے..........“ ”نہیں..........میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروا دیں، لیکن ہماری ملاقات شام ڈھلنے کے بعد ہونی چاہیے“۔ رحمٰن صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں..........شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اُس نے ہمارے بڑوں کے ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آ جائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اُس کی پہنچ بھی دُور تک ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لیکن کیا یہ بہت عجیب بات ہے..........ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اُوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو اُس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا“۔ ”ایمرجنسی کے لیے“۔ اُس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے“۔ ”لیکن یہ معما کیسا ہے؟“ کچھ نہیں..........بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں۔ اور پھر آخر یہ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اُس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے“۔ میں نے گہری سانس لی ”مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا“۔ ”میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے“۔ ”اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اُس کے گھر تک پہنچا دیں یا مجھے اُس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“ رحمٰن صاحب اب بھی کچھ مخمصے میں تھے۔ ”ہاں..........یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..........میرا عملہ تمہیں ریحان کی کوٹھی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اُس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرونِ ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اعلیٰ پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اُس کا مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی، کے مصداق پھیلتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لئے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔“ ”میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوٹھی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اُتار کر پولیس کی جیپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گھنٹی پر اُنگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے انٹرکام پر کسی کی آواز

اُبھری ”کون ہے؟“۔ ”میں عبداللہ ہوں، مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے“۔ فوراً جواب ملا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔“ انٹرکام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی، پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ”ہاں بولو.......... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

❀......❀

قلمکار کلب پاکستان

......اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
☆......آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوار دیں گے۔
......آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟
☆......ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
......آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
☆......ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
......آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟
☆......ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟
تو...... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔
مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔
ڈاکٹر صابر علی ہاشمی
قلمکار کلب پاکستان
0333 222 1689
qalamkar_club@yahoo.com

رُوپ بہروپ

میں کچھ دیر تو اُس آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی میں اُلجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ذرا درشتی سے پوچھا گیا ”تم کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟“ ”جی.......... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب سے بات کرسکتا ہوں..........؟“ دوسری جانب سے جھنجھلاتی ہوئی تیز آواز اُبھری ”میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔“ اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی۔ ”کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کرسکتا۔ آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟“ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ اُبھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دُور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطار سی چلتی گئی تھی اور جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دُودھیا روشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوٹھی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر برہمی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا، لیکن پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا ”معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے“۔ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے“۔ چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کا کیوں نہ ہو“۔ ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا ”ہاں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اُسی ساحلی مسجد کے طالب ہو نا، تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو“ ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دُور آیا ہوں اور خاص اسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹ دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ پکڑائے ”تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے اس کا براہِ راست تعلق ریحان صاحب سے ہی ہے، لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آسکتے تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اُس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا، لیکن میں نے مُڑتے مُڑتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھ لیا، حالانکہ میں نے صرف اشرف سے ہی اب تک اُس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پُراسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ

اور ریحان کے ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر بشاشت سی آ گئی۔ ''جانتے ہو میاں.......... کسی اُستاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے..........؟'' میں اُن کا مدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ''جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میری ''نالائق شاگرد'' والی اصطلاح پر وہ بھی مُسکرا دیئے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیشِ نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی، اس لیے میں حتیٰ الامکان اُن کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گرہیں مجھے خود کھولنا تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول اُن کے، یہ میرے کمزور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتیٰ الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تانبا زمین پر بہنے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریر بچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے چومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دُور نیچے آتی کولتار کی سڑک پر سفید مرسڈیز دوڑتی ہوئی اُوپر پہاڑی کی جانب آ رہی تھی۔ یہ مرسڈیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہو گا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رُک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ''چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشتا وہیں چل کر کر لینا۔'' سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن میں نکل آئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضا مندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنا رکھا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیمے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پل پار کرتے ہی دُور بڑی بڑی سبز چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا۔ جو ریحان کے گالف والی چھڑیوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھامے

کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اُچھالا اور گیند کچھ دُور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہوگئی۔ عملے نے ستائشی جملوں سے اپنے صاحب کی پذیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستانے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیئے۔ عملہ اِدھر اُدھر ہوگیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اُس کے سفید کرِچ جوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اُس نے میز پر پڑے جوس کے گلاس کے اُوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا۔ ''ناشتہ کرو گے.........؟'' ''نہیں.......... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا کوئی بچا ٹکڑا۔'' ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ وہ حسبِ معمول کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے شخص سے بات کر رہا ہو۔ ''کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سرد رویے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن عمر بھر کی پروئی خاردار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اُس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ''آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی.........؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد عینی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام باریکیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ سکوں۔ اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔'' ریحان نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ''تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں جاتا۔'' ''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں'' ریحان کی آواز بلند ہوگئی ''نہیں.......... میں اپنے ذاتی معاملات پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو''۔ میں نے واپسی کے لیے قدم اُٹھائے۔ ''بہتر ہے.......... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اِسی قدر فقدان ہے تو پھر میری یہاں موجودگی بھی بے معنی ہے''۔ ریحان نے مجھے آواز دی، ''سنو.......... تم.......... تم.......... سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح اپنے ہسٹریا پر قابو پا سکوں.......... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اُمید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے''۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین پر اس سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہوگا۔ اُس نے بات جاری رکھی۔ ''یقین جانو، کل جب سے مجھے تمہارا پیغام ملا کہ تم لیلیٰ کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں رات بھر سو نہیں پایا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جابر جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی لیکن اُس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہوگئی ہے۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی اُس سے جڑی

چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں روپے پیسے یا کسی صلے کی حرص نہیں ہے لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا ہوں۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔” ریحان اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے نہ جانے کتنی دُور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آ گئی تھی کہ لوگ میرے حلیے کو دیکھ کر مجھے محبت کی دہائی دینے لگے تھے۔ بہر حال، ریحان نے لیلیٰ کے لیے اپنے جذبات کھول کر بیان کر دیئے تھے۔ مجھے اُس کے لہجے میں کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہوا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے اپنے اندر کوئی کھوٹ کیسے پال سکتے ہیں۔ محبت ہمارے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہنے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پنپ سکے؟ محبت ہمیں اندر سے بھر دیتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریحان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لیلیٰ کی محبت نے اُس کے اندر کسی چھل کپٹ کا خانہ خالی ہی نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اُسے اپنا درد اندر دبائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریحان کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ “لیلیٰ نے مجھ سے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی..........” ریحان نے تڑپ کر میرے دونوں کاندھے اتنی زور سے پکڑ لیے کہ اُس کی انگلیاں میرے شانوں میں پیوست ہونے لگیں۔ “کیا.......... لیلیٰ نے تم سے کیا کہا تھا.......... مجھے بتاؤ.......... خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ..........” اور ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے جھماکے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا لیکن ریحان کی آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی پل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بیک وقت مجھ سے میری فرزانگی چھین بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک ان جانی روشنی بھی کسی درز سے مستقل چھن کر آ رہی تھی۔ میں دھیرے سے بولا “لیلیٰ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔” ریحان کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دُور کھڑے یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اُس کی حد وہیں تک تھی۔ بادل نخواستہ وہ پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اتنی جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی گیلے اسپنج کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز لرز رہی تھی “لیکن.......... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی..........” “یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی ان جان عورت کو، جسے اُس رات پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔” ریحان بالکل ہی چپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، کیونکہ کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر بستی چلا جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر میں واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم جس سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہی ایک عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ کچھ انہونی ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی، الہام اور وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور ٹنوں جیسا وزنی اور ہمارے کومل انسانی وجود پر ایسے لمحات بے حد گراں اور بھاری گزرتے ہیں تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن توڑ رہا تھا۔ آج ہفتے کی رات تھی، لہٰذا ساحل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت ساحل کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آ گئی تھی

لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے اِردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب چلا گیا۔ ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لوگ اِدھراُدھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات پی رہے تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں اُن سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دُور پہاڑی سے نیچے جھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرا رہتی تھی۔ جانے سلطان بابا نے اُسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرا کو براہِ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی روزِ اوّل کی طرح موجود تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے دھیرے سے آواز دی ”عبداللہ..........“ میں چونک کر پلٹا، لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا وہم سمجھ کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ”عبداللہ۔“ عجیب سی کرخت، لیکن نسوانی آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے میرے سارے جسم کا خون ایک ہی پل میں میری نسوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سُرخ پلّو میں چھپائے اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں.......... یہ وہی تھی، جسے اُس رات میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی تلاش میں پولیس دربدر بھٹک رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بمشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔ میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ ”تم اُس روز بھاگ کیوں گئی تھی..........؟“ وہ غرائی ”میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دُور رہو۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جا سکتی ہے“۔ میں نے گہرا سانس لیا ”تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ وہ دبی آواز میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو مولوی.......... اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اُس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر موجود تھی جب وہ نیچے گری تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُسے نہیں مارا، لیکن اگر وہ میرے اور ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اُس کی آواز میں اس قدر سفاکی تھی کہ میں اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اُس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُس کی شخصیت میں کسی بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرائی ”میں تمہیں آج آخری بار تنبیہ کرنے آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت جگانے کی کوشش کی تو اگلا نمبر تمہارا ہی ہوگا“۔ اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے لیے اُن کی طرف لپکیں۔ جونہی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ ہٹی تو میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے پہنچا۔ مجھے دُور اندھیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی گاڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ کسی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اُسے پولیس کے پہرے کا

اندازہ ہوگیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اُس نے ساحل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے گھرانے اس پوائنٹ کا رُخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اُس کی گاڑی فرائے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اُٹھتے وقت میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

* * *

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

ہم زاد

اُس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس عفریت کے کتنے رُخ ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو جب بھی یہ سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اُسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح میں نے ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمٰن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھانہ ماہی میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسبِ معمول اُن کا چہرہ سگریٹ کے نیلے دھوئیں کے پار دھند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپہ مارنے کا کہہ رہے ہو۔ وہاں دن میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلانا پڑتی ہیں۔ مجھے محکمے سے اجازت ملنا تو دُور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سست سنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا“۔ ”لیکن آپ کی اتنے عرصے کی نوکری میں چند افسرانِ بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ انہیں بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں کارروائی کی اجازت دیتا ہے جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ ہلتی ہو۔“ رحمٰن صاحب نے ایک لمبا سا کش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ”بہت تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری اَن دیکھی حدیں ہمیشہ ہی سے مقرر ہیں۔“ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے ”ٹھیک ہے.......... آج یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ سجھائی بھی نہیں دے رہا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی ترچھا پڑا تو حکام کو مجھے فارغ کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے حجرے میں اپنا بستر ڈالوں گا“۔ انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے ساتھ اپنی منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوا لیا گیا۔ رحمٰن صاحب نے اپنے عملے کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کرنے کا نہ کہیں، تب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا پیغام یا فون انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجیب سناٹا طاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت کے دروازے کو مقفل پایا۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد تالا توڑ ڈالا۔ اندرونی جانب سے دو تین سہمے ہوئے نوکر اور خدام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکلنے کی تگ و دو میں تھے۔ انہیں اطمینان دلوایا گیا کہ کوتوالی کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اُوپری منزل کے کمرے کھلے پڑے تھے، مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو گھنگھروؤں کی جوڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ اگلا کمرہ چھوٹا سا ہال تھا، جہاں طبلہ اور ہارمونیم سلیقے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ ہمارے اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگاتار رحمٰن صاحب کے ڈرائیور، گارڈز، تھانے دار اور دیگر عملے

کے دستی وائرلیس سیٹ (واکی ٹاکی) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رحمٰن صاحب کو اعلیٰ حکام اور شہر کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایات کی جارہی تھیں کہ وہ جہاں بھی ہوں، اپنا مشن ختم کر کے فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے لیکن ایس پی صاحب اپنی آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جارہے تھے اور ہر کمرہ بے حد سجا ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان دیا گیا تھا، لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرہ بند ملا۔ رحمٰن صاحب نے اندر موجود فرد کو تنبیہہ کی کہ دروازہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز اُبھری "تھوڑا انتظار کریں.........." کچھ دیر بعد کسی کے تھکے قدم گھسیٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کاسمیٹکس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے سے مجھے وہ سرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آگئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ ایک عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر عملے کے کسی فرد نے کمرے کی بتی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس سکڑے سمٹے وجود پر پڑی۔ رحمٰن صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اُٹھا اور پولیس کا سارا عملہ رحمٰن صاحب سمیت ہکا بکا رہ گیا۔ عورت کے بھیس میں ہمارے سامنے ریحان کھڑا تھا اور اُس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ رحمٰن صاحب نے حتیٰ الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور میڈیا تک اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہ سرخی ملک کے بڑے صنعت کار ریحان کی اپنی منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس عورت کا پیچھا کرتے ہوئے گر پڑا تھا۔ تب نیچے ریت میں مجھے سفید کریچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں میں سے ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو رات بھر نہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ نسوانی آواز میں پولیس کے عملے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا تو کبھی اُن کی منت کرتا کہ اُسے واپس جانے دیا جائے کیوں کہ گھر میں "ریحان" اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

میں نے رحمٰن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر حال میں ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لاتعلق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف خلا ہی میں گھورتا رہتا۔ اُس نے صبح ہی اقرار کر لیا کہ "وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی" لیکن ہاتھا پائی کے دوران لیلیٰ کا پاؤں پھسلا اور وہ اُونچائی سے گر گئی۔ ریحان کے بیان سے لگتا تھا جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے میں بیان دے رہا ہو، لیکن "وہ" کون تھی جو ریحان کے اندر سالوں سے بسیرا کیے بیٹھی تھی۔ یہ وہ معما تھا جس کا سراغ ماہر نفسیات دانوں کی سات رُکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

تفتیش کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والا ریحان ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اُسے بیٹے کا پیار دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اُس کے ساتھ کھیلتی۔ لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بچے کو گھر

سے باہر کم ہی نکالا جاتا۔ پھر نہ جانے کب ریحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اُس کی پرانی سیکرٹری کی جگہ صرف چند دن کے لیے آئی تھی، داخل ہوگئی اور دھیرے دھیرے اُس کے دل و دماغ پر نہیں، پورے کاروبار پر قابض ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے چھپا اپنے ماں باپ کو چیخ چیخ کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اُٹھانے لگا اور ایک دن تو ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ کچہری تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اُس کے والدین آکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اُس کے باپ نے جانے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا روتے ہوئے اپنی ماں کو نانا کی کار میں پچھلی سیٹ پر ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آخری دو آنسو ہمیشہ کے لیے ریحان کی رُوح کو بھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اُسی دن اُس کے اندر کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہوئی تھی، جس میں سے ایک حصہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ماں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

باپ نے ننھے ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا تو اپنے وفادار ڈرائیور یعقوب کو ہدایت کی کہ اُس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بہلنے کا کچھ سامان کیا کرے۔ ڈرائیور کو اور تو کچھ نہ سوجھی، وہ اداس ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے آتا، جہاں اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ اُن کے صاحب کے لاڈلے کا دل بہلا رہے۔ لڑکیوں کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپاکی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو سستی نیل پالش اور سرخی سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی ماں کو طلاق بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔ کنول نے دو چار دن غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا لیکن جلد ہی وہ اس ناٹک سے اُوب ہوگئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلے پن کی حد تک ہوتی تو بھی کنول شاید ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی لیکن کچھ عرصے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان مینیجر غیاث کی غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے کوٹھی کے چکر لگانے لگا تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی زہر لگتی۔ ایسے میں یا تو ریحان کو اُوپر اُس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر کوٹھی کے پچھواڑے بھیج دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اس کو مختلف طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اُسے سیڑھیوں سے جڑے کمرے کے نیچے والے تہ خانے میں بند کرنے کی دھمکی دیتی تاکہ وہ اپنے باپ کو رات گئے واپسی پر مینیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر اگر یعقوب کی گھر والی اور بچیاں کہیں گئیں ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اُس کے ہاتھ کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سرخی لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس نے آنکھوں میں کاجل بھرنا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا۔ پھر ایک دن اُسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آگئی تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اُٹھا لایا اور کئی دن تک مختلف شیڈز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بدقسمتی سے اُس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اُس کی ماں نے جو نوکرانی پر اس کٹ کی گمشدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں کا قہر اس دن عروج پر تھا اور اُس نے سزا کے طور پر ننھے ریحان کو اُس کی

زندگی کا سب سے بڑا خوف اُسی تہ خانے میں قید کر کے بخش دیا جس تہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اس تاریک تہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈر سے کانپتے گزارے۔ اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد ہو۔ اس تہ خانے کی دیواروں پر اُس روز اندھیرے میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب ہیولے بنتے اور مٹتے دیکھے کہ اُس دن اُس کی اپنی شخصیت ہی ایک ہیولہ بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہ خانے سے باہر کھینچ لائی لیکن اُس کی روح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سوتے وقت بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہو گیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے قریبی دوست بنتا گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اب اس تنہائی کو دُور کرنے کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اُس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آباد کر لی تھی، کیونکہ اُس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر دو میٹھی باتیں ہی کر لیتا یا اُسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد کر لی۔ رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بجھ جاتیں تو وہ چپکے سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ جاتا اور ادھر اُدھر سے چرائی سُرخی اور غازہ اپنے چہرے پر مل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی آدھا چہرہ اُس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ داہنی حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی، اسے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے حصے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے بات کرنی ہوتی تو وہ اپنے چہرے کا بایاں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال کرتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوریاں سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر آئینے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اُسے شیشے میں جھانکتی نظر آتی جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش پوری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہمدرد اُسے ایک اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ اس تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح تک ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان کا ماتھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رُخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اُس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا تھا، لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سرِ شام ہی بھاگنے کی کرتا، کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اُس کی پیاری اور مہربان دوست نے جو آنا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر کے مکین اُٹھے تو تمام تجوریوں اور زیورات سمیت بینک بیلنس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور فیکٹری کے مینجر کی بھی کوئی خبر نہ ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی ہوتی تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اُسے بستر پر ڈال دینے والا صدمہ بے وفائی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی اپنے چاہنے والے فیکٹری مینجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اُس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے ایک منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اُٹھ سکا اور

پندرہ سالہ ریحان کو اپنے وفادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو بھی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا، لیکن اب ریحان جوان ہو رہا تھا اور اُس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اُس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، یعقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے صاحب کے اندر پلتی دو الگ شخصیات کا حال دے گئی، کیونکہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرِ شام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر پلتی اس عورت کے ساتھ اتنی دُور آ چکا ہے کہ اب اُس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتہ تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اُس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ بچپن میں وہ اُس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھڑی رُک کر بات کر لیتا یا کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا تو اُس کی رُوح کی قابض باقاعدہ اُس سے لڑتی، جھگڑتی اور رُوٹھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اُس سے پوچھتا ’’آج کچھ چپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا‘‘۔ داہنا میک اپ زدہ حصہ منہ بنا کر کہتا ’’تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اُس پھلجڑی شائستہ کے نخرے اُٹھانے سے ہی فرصت نہیں‘‘۔ ریحان اُسے مناتا ’’اوہو............ اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹینٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ............‘‘ فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی ’’ہاں، ہاں............ تین چار ہزار کے عملے میں سے اُسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتر............ ٹھیک ہے اگر تمہیں اُس کی اتنی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُسی کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟‘‘ ریحان بے بس ہو جاتا ’’اوہ............ تم پھر رُوٹھ گئیں۔ اچھا بابا...... پکا وعدہ...... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔‘‘ جواباً نیم رضا مندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ ’’خوب جانتی ہوں میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے نا کہ میں تمہیں بھوکا سوتے نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا ستاتے ہو۔ اچھا چلو اب منہ نہ بسورو۔ اُٹھ کر کھا لو۔‘‘ ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا، لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے تک یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اُس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اُجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں اور رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اُس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اُس کی سب سے بڑی رفیق تھی، لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی

علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے پر کمپنی میں رکھی گئی تھی، لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کومل سی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی رات کو رازداں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور خواتین تو اُس کے دفتر سے سات در پرے ہی گزرا کرتی تھیں لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اُس کی جانب کھینچے لے جا رہی تھی۔ شاید اُس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے اِردگرد چکر نہ کاٹنا ہی ریحان کو بھا گیا تھا، لیکن اُس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ پاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا بگڑی کہ اُس نے کمرے کا سارا کانچ توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے سرونٹ کوارٹرز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب وغریب شور شرابے کی دُور سے آتی آوازیں سنتے رہے، کیونکہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا جو ایسے موقعوں پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی، لیکن اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اُس رات بھوکا سویا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصے کے عالم میں اُس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

* *

آدھا جنوں، آدھا فراق

ریحان شدید اذیت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کرسی پر ڈھلکا ہوا تھا کہ اس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کمپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالج خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اُسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا، اور در حقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اُس کی مانتے ہی بنی۔ یہی وہ سات دن تھے جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم سہما سا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی چھم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانٹے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سورج ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اُس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں مانتی تھی۔ اُس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کمپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اُس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روٹھی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اُس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں پر دستخط کروانے کوٹھی بھی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت سماجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کو تکتی رہتی۔ ریحان کی حالت ان تینوں دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیونکہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا، پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دُور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی۔ لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی الجھی اُلجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے آگے دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کیبن کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کانچ کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں اُلجھا ہوا دیکھتی رہتی تھی۔ اُسے یہ کھویا کھویا سا، اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت ہی شائستہ اور نفیس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی ہیجان

کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا۔ ٹھیک اُسی وقت لیلیٰ نے آ کر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروانے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا پیغام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہو گئی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی اُلجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا تو بالکل ہی بجھے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اُس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے چاری کو کیا پتہ کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی سیڑھی پھلانگ کر اُس تک پہنچتا ہے۔ لیلیٰ شروع میں اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی انتہا پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اُس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام ڈھلنے کے بعد کہیں آؤٹنگ کے لیے لے جانے کی ضد کر بیٹھتی، اُس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیونکہ سارا دن تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں اُلجھا رہتا۔ بس، گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقعے پر کوئی دل کی بات کیسے کی جا سکتی تھی، حالانکہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیونکہ ریحان نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا، لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ ہی تمنا رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے۔ لیکن شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیاں سی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھورے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور آج تک کبھی کسی نے اُسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹرکام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف کاغذوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پسیجتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اُس کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی تو ریحان نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ اُمید ضرور دیا جلائے رکھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام کے بعد بہت ضروری فون بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کوٹھی کے گیٹ تک بھی جا پہنچی مگر اس کے لاکھ سر پٹخنے پر بھی دربان نے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ الٹا اگلی صبح ریحان لیلیٰ پر بری طرح برس پڑا کہ وہ اس کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اس کی چوکھٹ پر کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کے لاڈ اٹھائے۔ اسے اس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اس کا دل بہلایا اور اس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اسے ریحان کی ضرورت پڑی تو ریحان اس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس نے ریحان سے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آ جائے گا۔ لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ

نبھا پایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اُس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیے تو دونوں ہی مسکرا دیے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اُس سے ضد کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے۔ لہٰذا ریحان اُسے رات کو کہیں مدعو کرے۔ ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز راز ہی رہنا چاہیے، لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا اور اُجالا ہوتے ہی اُسے ریحان کی رُوح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ پر صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دُور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بعد ملنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اُسے بڑھاوا دیتی کہ اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اُس سے جلد از جلد ملوا دو۔ آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اُس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اُس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تمہارے کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔ کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اُسے لگتا کہ اُس کے اندر پلتی وہ عورت، اس کی ہم زاد ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اُس کا حق بھی تو تھا۔ آخر دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دلِ ناداں ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ سے شام کے بعد ملنے کی ہامی بھر لی۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان کے خیمے کی زمین سے بندھی گرہیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہواؤں میں اُڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اُس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑھی پہنی، بالوں میں گجرا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے ٹیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اُسے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آ چکی تھی۔ اُسے وہاں پتنگ اُڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اُڑائے گی اور اُسے اتنا اُونچا کر دے گی کہ اُس کی پتنگ اُس کے اور ریحان کے ملن کے ستارے کو چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی ٹیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پٹا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اُس نے دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی لیکن وہ گاڑی تو اُسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اُس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بپھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آ کر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چونکی، جب دھیرے سے کسی نے اُس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو نکالے کچھ دُور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ ڈر سی گئی۔ ”جی.......... آپ کون؟“ اور پھر وہ عورت قریب آ گئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا بھیانک حلیہ کیوں بنا رکھا ہے؟۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ موڑ کر بولا کہ لیلیٰ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر پلتی آدھی عورت اور آدھا مرد.......... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سوچے، کیوں کہ ریحان کی دہری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا ادھوری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اُسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس نے چلا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اُس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہے۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کا ساتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔

یہ سُنتے ہی چہرے کے دائیں جانب والی بگڑ گئی اور غرا کر بولی کہ ”وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے لیکن اب اگر اُس نے، اُس کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت بُرا ہوگا، کیونکہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت ہے۔ لہٰذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف کا رُخ نہ کرے۔“ لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلاتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اُس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوتِ ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت کو اپنے وجود سے باہر نکال نہ پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ ریحان لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اُس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھتکار رہی تھی، اس پر چلا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اُس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش مکش میں نہ جانے اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اُس کی سوت نے اُسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن تب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑھی کا پلو گہرائی کے خلا میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھ آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہذیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سن ہو چکا تھا اور اُس کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت اُس کی تمام ڈوریں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اُسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدھی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اُس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اُس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اُس وقت اُس سے

ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اُس رات اپنی ہم زاد سے اُس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اُس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی، تب ہی اُس نے مسجد کے اُس طالب علم کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر پہنچ جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوٹھی بلوا لیا اور عبداللہ نے جب اُسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اُس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا دے گا لیکن شام ہوتے ہی اُس کی رُوح کی قابض نے حکم دیا کہ چل کر اُس عینی گواہ کو دھمکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوٹھی آنا اور یوں ریحان کے دل میں دبی چنگاری کو ہوا دے کر لیلیٰ کی یادیں اُبھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اِسی لیے وہ اُس رات ساحلی چوٹی پر اُس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح سے گالف کے لباس ہی میں تھا اور اس کا اپنا من بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے کیونکہ وہاں اُسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلا تو آیا لیکن اپنے سفید کرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج تھا۔ بہر حال، یہی جوتے اُس کی گرفتاری کا سبب بن گئے۔ لیکن پولیس ابھی تک مخمصے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو..........۔

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمٰن صاحب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کیس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیں ہلا دی تھیں۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اُس کی حالت شام کے بعد انتہائی ابتر بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (Split personality) کا کیس ہے یا پھر دُہری شخصیت کا تضاد (Multiple Personality Disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس میں اگر ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے تو پھر وہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ مخلوق ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ کیونکہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمٰن صاحب کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے بھی اُن سے رُخصت چاہی تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولے، ”تم کون ہو؟“ میں اُن کا سوال سن کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں.......... آپ جانتے ہیں..........“۔ ”نہیں.......... میں وہ جاننا چاہتا ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا.......... لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو.......... اوروں سے کچھ سوا.......... کچھ الگ“۔ میں نے بات ٹالی ”آپ کا واہمہ ہے۔ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں۔ بلکہ شاید اُن سے بہت کم، بہت عام..........“۔ لیکن انہوں نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں ”ساری تفتیشی ٹیم اس

پُراسرار عورت کی کھوج میں تو تھی لیکن ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہ ہو گی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے وجدان کی کاری گری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑتا گیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں..........؟“ کچھ دیر چپ رہا“ آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام.......... سچ یہی ہے کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سن کر ہی اُس کے گھر گیا تھا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے جڑتا محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اُس کے جوتے کا سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی گئی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔“ اتنے میں میز پر پڑے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ رحمان صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رحمٰن صاحب نے جلدی سے کہا“ ٹھیک ہے.......... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں“۔ انہوں نے فون رکھ کر میری جانب دیکھا،“ ریحان اپنے حواس میں آ چکا ہے اور تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے“۔

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گلابی دھند

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سامنے کچھ بھیڑ تھی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اُس کی میت لے جائی جا رہی ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقاء اور آس پاس کے چند راہ گیر کاندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے یوں لگا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے جتنے لوگ اُس کے جنازے کو کاندھا دینے اور اُس کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نفع خود ''انسان'' ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف ادوار میں نقصان کی صورت میں کھو دیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ یہ بے رحم ''وقت'' کیسے ڈاکا مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ کر چل دیتا ہے اور اُس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ رحمان صاحب کی جیپ نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمٰن صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''جاؤ.......... جا کر اُس سے مل لو..........''۔ ''آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ؟'' ''نہیں.......... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا''۔ میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق و چوبند سپاہی کے ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل یخ بستہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو اس کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور اسے کمرے سے زیادہ بیرک کہنا مناسب ہوتا، کیونکہ چوکور کی بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دُور تک بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔ آہٹ سن کر ریحان نے سر اُٹھایا، لیکن یہ.......... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا سنورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جبکہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے، چہرے پر برسوں کی تھکن، بال اُلجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے والے ریحان کے چہرے یا لباس پر شکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے عمر بھر کی ''بے شکنی'' کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے پر ہی جما رہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتدا کی ''تم آگئے

عبداللہ...... ’’میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا......‘‘۔ میں اُس کی جانب بڑھا ’’یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے...... وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی تو اُسے کتنا دکھ ہوتا......‘‘ ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ’’جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں تو پھر بننے سنورنے سے کیا فائدہ......؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اُٹھانی پڑی، تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حوالات میں راتیں کاٹنی پڑیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا‘‘۔ میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

’’معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا مداوا ہے تو تم مجھے معاف کر دو، کیونکہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں‘‘۔ ریحان تڑپ سا گیا۔

’’نہیں...... بالکل نہیں...... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چننا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری رُوح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جمع پونجی نہ لٹتی۔ کاش......‘‘ بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے، تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہمدردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اُتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹھ کر رونے والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اِس کے سامنے توڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ’’میری ایک بات مانو گے ریحان......؟‘‘ معصوم سے بھولے بچے نے سر اُٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اُس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ’’جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تنہائی میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا...... اتنا رونا کہ یہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دُھند میں تمہیں لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے یقین ہے، تمہارے آنسو اس دُھند کو چیر کر اُس تک ضرور پہنچیں گے۔ پھر اُس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب بھی مسکرا کر تم سے بات کرلے گی۔‘‘ ریحان نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کی آنکھوں سے بہتا پانی مسلسل میری ہتھیلیوں کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ زمانے کے لیے وہ ایک قاتل تھا، لیکن کیا کبھی کسی نے اتنا معصوم قاتل بھی دیکھا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ ’’اور ہاں...... مجھے تم سے اپنے ایک اور جھوٹ کی معافی بھی مانگنی ہے۔ میں نے تمہیں لیلیٰ کے آخری جملے کے بارے میں جو بات کہی تھی۔ وہ صرف اُس پُراسرار عورت کا کھوج لگانے کے لیے میری ذہنی اختراع تھی پتا نہیں کیوں اور کب میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے کہہ دی۔ مجھے اپنے اس جھوٹ پر بے حد شرمندگی ہے‘‘۔ ریحان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ’’لیکن تم نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے خود اُس رات نیچے جھانک کر دیکھا تھا، تم لیلیٰ کے گرتے ہی چند لمحوں بعد اُس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اور ٹھیک اُس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔

ضرور لیلیٰ نے تم سے کچھ بات کی ہوگی مگر تم اپنی دگرگوں ذہنی حالت کی وجہ سے یاد نہیں رکھ پائے''۔ اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا تو گویا میری زبان سے جو لفظ ادا ہوئے تھے، وہ میرے ذہن میں ٹھیک اُسی وقت نہیں آئے تھے، جب میں ریحان سے اُس کے گھر گالف کورس میں ملا تھا۔ لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوئے وہ لفظ میرے سوئے ہوئے ذہن کی کسی دراز میں بند رہ گئے تھے اور صبح جب مجھے پولیس نے ساحل سے گرفتار کیا تو میرے جنوں کا وہ دور حسب معمول میری یاد سے محو ہو گیا، لیکن جب ریحان میرے سامنے آیا تو یاد کی کھڑکی سے لیلیٰ کا وہ جملہ ہوکے ایک جھونکے کی طرح آیا اور میری زبان سے ادا ہو گیا۔ مجھے انسانی ذہن کی بھول بھلیوں اور اس کے کرشموں سے ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ جانے کتنے شعبدے جانے، کتنے عفریت اس چھٹانک بھر کے ذہن میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس ذہن کی موجودگی میں شاید ہر انسان ایک چلتا پھرتا آتش فشاں ہی تو ہوتا ہے، جو کسی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔ ریحان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی صرف اور صرف یہ ذہن ہی تھا۔

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اُس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں ہوتی تو میں اس کو تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود دیوانگی کی راہ پر گامزن تھا۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اُس کی ہم زاد سے اُس کی جان چھڑانے کے لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سرِ شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم میں ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سویا رہتا ہے۔ لیکن بقول ریحان، اُسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیونکہ وہ بہت پہلے خود بھی یہ نسخہ آزما چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اُسے نیند آ جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند دن بعد تو وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی۔ نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اُسے نیند کی دوا ترک کر دینی پڑی اور پھر اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ''کیا میں بھی اُسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا.........؟'' میں جواب دیتے ہوئے رو پڑا کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا کر مانگنے ہی کو دعا کہا جاتا ہے تو میں یہ مشق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ''یا مالک.........اس انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر.........'' میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے باہر کے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھنتی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی اور ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیور کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعہ اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی رُوحانی ماں کے برابر تھی، اُس نے اُسے نماز اور سورتیں یاد کروائیں تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اُسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان باوضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اُسے خود بخود سب یاد آ جائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔ مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہمیں سانس لینا سکھاتا بھی نہیں تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک دم ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اُس کی عمر بھر میں اُس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح سے شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی انمول باتیں بانٹی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجیب سے درد بھرے لہجے میں التجا کی "پھر آؤ گے نا عبداللہ......؟" "ہاں......... ضرور......... کیوں نہیں......... اور اُس دن ہم صرف تمہاری لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پتنگوں کی باتیں، دھانی آسمان اور نیلی ڈور کی باتیں......... جھاگ اُڑاتے سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں......... ٹھیک ہے نا.........؟" وہ بہت خوش ہو کر بولا "ہاں...... بالکل ٹھیک ہے......... لیکن پکا......... تم آؤ گے نا......... ہاں......... بالکل پکا........." میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھپتھپایا اور ہیڈ نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اُس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پنکھ اس کے بوجھل پپوٹوں پر پھیرنا شروع کر دیئے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور دھیمی سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اُس کی زندگی کی سب سے پرسکون نیند کی رات ہو گی۔ نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں مگر بنا نیند کے......... میں ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری بھیگی پلکیں مجھ سے بہت سے سوال کرتی رہیں مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اُترا تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے باہر ہی ٹہل رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب کی نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو لایا گیا، مگر معاملہ اُس کی پہنچ سے دُور کا تھا۔ لہٰذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا چکا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند کا ٹیکا لگا تو دیا ہے لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سرہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہمدرد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ اس پوری راہ میں میں نے زہرا کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہموار تھی، عبداللہ کی زندگی اُسی قدر دشوار اور ہچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس جذبے کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہونا ہی اصل میں خوشی ہے۔ ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسبِ معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانکی انداز میں کھل گئیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے انہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُن سے پوچھا "آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں.........؟" سلطان بابا کے نحیف چہرے پر ہلکی سی مسکان آ گئی۔ "ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے، میاں اور پھر جسے عبداللہ جیسا تیمار دار میسر ہو، وہ بار بار بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے؟ میں نے منت سماجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلتے ہی میں نے رحمٰن صاحب کو فون

کر کے کسی سواری کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد کے باہر موجود تھے۔ ہم نے سفر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے کے ہچکولوں سے بچایا جائے، کیونکہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی ہدایت کر دی۔ میں اور رحمٰن صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے والے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں اُن کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ان بزرگ کو ماضی قریب میں کوئی سر کی شدید چوٹ لگی ہے شاید۔'' ''جی.......... کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا ''تو میرا اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہو گئی ہے۔ لیکن میں حتمی رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں کی رپورٹ میرے پاس آ جائے گی.......... اللہ خیر کرے گا''۔ ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا کو فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی نلکیاں اور بوتلیں اُن کے جسم سے چپکا دی گئیں، جن سے انہیں شدید چڑ تھی۔ رحمان صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پرے کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اُڑنے پر آئے تو پر لگا کر اُڑتا ہے اور جب سرکنے پر آئے تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بنچ پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فنا کر دیئے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہو گیا۔ درمیان میں دو مرتبہ رحمٰن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے ریحان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک پل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمٰن صاحب بھی آ گئے۔ میں نے اُن سے ریحان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہو گیا اور اُن کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمٰن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ ان ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمٰن صاحب نے بتایا کہ ریحان اس رات بے حد پرسکون نیند سویا تھا اور اُٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پرسکون رہا۔ لیکن سہ پہر کے بعد اُس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اُسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے مگر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا۔ شاید اُس کا وجود اندر سے چیخ رہا تھا اور برسوں سے اُس کے اندر پلتی دہری شخصیت کو جب لگاتار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اُس نے ریحان کے اعصاب اُکھیڑنا شروع کر دیئے تھے۔ ماہر نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر ریحان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں ریحان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً ریحان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا جنون بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی

پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اُسے بجلی کے جھٹکے دیئے گے لیکن ریحان جس گلابی دُھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اُس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونج رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی پیاری ماں کو لوگ اُس سے چھین کر لے جا رہے ہوں اور وہ رو رو کر اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو کہ اب اُسے رات کو لوری کون سنائے گی، کون صبح اُس کے بال سنوارے گی اور کون اُسے ہنس کر اپنے سینے سے لگائے گی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ ریحان کے ساتھ ساتھ میں بھی اسی گلابی دُھند کے پار جا رہا ہوں۔

※……※

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

''ہوش والوں کو خبر کیا............''

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا ناطہ اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اُس جیسے نازک احساس والے کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں، جہاں کانچ کا من رکھنے والوں کو ہر دم پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد ذرا دیر کے لیے غنودگی کی چادر اوڑھی تو میں رحمٰن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی آہنی چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ ریحان گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اُٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر جلدی سے ہماری جانب سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک ہی جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ رحمٰن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میری امی کب آئیں گی..........؟'' رحمٰن صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔ ''تمہاری امی جلدی آ جائیں گی، شرط یہ ہے کہ تم روؤ گے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے''۔ ریحان خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے.......... پکا؟'' رحمٰن صاحب نے اُس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''بالکل پکا..........''۔ وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تمیزدار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق کسی جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کومل، کتنے ملائم احساس والا.......... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازیاں، دشمنیاں، حسد، برائیاں، کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سیکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان کی طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے تو اے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانوں ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس ساہوکار کی طرح لین دین اور نفع و نقصان کے پھیرے میں پڑے رہتے ہیں لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود میری اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سلگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھڑکتا شعلہ بن کر میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا کہ صبح میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنوں کے حتمی نتائج دیکھنے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں دستیاب ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے

ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر میں صرف ایک جہاز اُڑتا تھا اور بدقسمتی سے آج وہی دن تھا اور اُڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے جانے والی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار تھا، پھر نہ جانے رحمٰن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ کر یہ مژدہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا ہے اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اُس کی روانگی ہے۔ رحمٰن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کیبن مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے ٹھیک پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اُتار دیتا۔ بقول رحمٰن صاحب یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل کی جانب چل پڑتے کیونکہ سات دن بھی اگر موسم یا کسی دوسری انہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی رہ جاتی تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا اور میرے ساتھ سامان سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز جس کی سات منزلیں تو دور ہی سے گنی جا سکتی تھی، کسی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا کا سابلانکا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے سیڑھیوں پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اسی جیسے ایک دیو ہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی محبت کی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رحمٰن صاحب کے عملے نے ایمبولینس سے اُتار کر اسٹریچر پر لیٹے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے بھونپو نے ایک زوردار ہنکارا ابھرا اور میں نے رحمٰن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے "زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہو گی۔ میں جانتا ہوں تم نے سلطان بابا کی حالت کے پیشِ نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست کہ اپنے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اپ بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے بے حد فکر مند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی سب چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے.........."۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ تب تک وہیں بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اُچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا گہرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔

جہاز نے جس وقت لنگر اُٹھایا تھا، اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں سلطان بابا کو اُن کے کیبن میں دوا کھلا کر، کمبل اوڑھا کر باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بھی بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کے ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اُس کی سنہری کرنوں نے اُفق تا اُفق لہروں کو اپنا سونا سونپ کے درخواست کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے.......... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جوان معصوم کرنوں کی مانتا۔ نتیجتاً ازل سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔

میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھتا رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا تو احرام باندھے کوئی عازمِ حج کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمین

حج کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی، وہ راہِ حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا’’ کہیں بہت دُور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جادو تمہیں کھینچ نہ لے...... اس لیے مخل ہوگیا۔ معافی چاہتا ہوں‘‘۔ میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ ’’میرے اندر بیک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھاٹھیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو ٹونا میرے لیے نیا نہیں‘‘۔ ’’بہت خوب...... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ میں نے جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا‘‘۔ ’’جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضمحل ہے اُن کی۔ ہم اگلی بڑی بندرگاہ پر اُتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔‘‘ اُس نے باآواز بلند کہا ’’انشاءاللہ......‘‘۔ کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پیندے سے ٹکرا کر فنا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہی آدابِ تکلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی ’’البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے۔ کتنے عرصے میں پہنچ جائیں گے، اُس کے گھر......؟‘‘ ’’شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن پچیس سالہ زندگی کا حاصل ہے۔ تم نے حج کیا ہے......؟‘‘۔ ’’نہیں...... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی...... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل کبھی ہو بھی پائے گا یا نہیں۔‘‘ وہ ہنس دیے۔ ’’سب بلاوے کی بات ہے میاں...... بلاوا آجائے تو لمحوں میں انسان کا اندر تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہیں پاؤں گا۔ لیکن جب بات بننے لگی تو یوں بنی کہ جیسے بس اسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر گئی ہے۔‘‘ وہ کافی دلچسپ انسان تھے۔ اُن کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ اُن کا مشترکہ کیبن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے، اُنہوں نے بتایا کہ وہ چند سال پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے اُن کا دُور دُور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ میں نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ ’’آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟‘‘۔ ’’میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔ ویک اینڈ پر پارٹی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔‘‘ جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ اُن کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دیے۔ ’’ایسی کوئی بات نہیں میاں...... میں نے کہا نا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہوگیا تھا، لہٰذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں‘‘۔ وہ دُور اُفق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا، لہٰذا لوگ قریبی مقامات تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تہوار جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے جمتے ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دُھن گنگناتا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپیڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکلے جاتے تھے۔ حبیب قریبی چوراہے کے سگنل پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ’’نوجوان...... ‘‘کیا تم دو لمحوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو؟۔ حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ ’’جی فرمائیے......‘‘ ’’کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے......‘‘ حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اُس کا مقصد سمجھ کر مسکرائے۔ ’’نہیں...... پیسہ نہیں...... صرف وقت...... اور وہ بھی دس منٹ......‘‘ ’’لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے

گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے"۔ "تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو۔ اُس اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام دہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے"۔ حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کا دل پسیج گیا۔ "ٹھیک ہے......لیکن صرف دس منٹ......ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیونکہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شو کا اہتمام کرنا ہے"۔ سگنل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننے شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جمی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا "تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے......؟" تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ "دس منٹ پورے ہونے کو ہیں، تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیئے۔ جزاک اللہ......" لیکن حبیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔ "کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں......میں اپنا وقت کور کرنے کے لیے زیر زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔" بزرگ نے بنا کچھ کہے پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ تلاوت کی۔ حبیب نے گھڑی دیکھی "اگر میں اپنے عملے کو موبائل کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں تو وہ میرے پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سُننا چاہوں گا"۔ پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی۔ لیکن حبیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شو ختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کیفے میں آئے گا اور پوری سورۃ دوبارہ سنے گا۔ وہ رات بھی آ گئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی لیکن معاملہ اب بھی وہی تھا۔ حبیب کی تشنگی......پھر طے یہ ہوا کہ حبیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حبیب نے ہچکچاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب اور یہ پورا پیغام سننے کے لیے اُسے ان لوگوں کے ساتھ کتنا وقت بتانا ہوگا؟ کیونکہ تین دن تو وہ کسی نہ کسی طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا "جزاک اللہ"۔ اور تین دن کے لیے حبیب البشر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ پھر تین سے دس اور دس سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد حبیب گھر پہنچا تو وہ حبیب نہ تھا، جسے اُس کی گلی نمبر 128 والے لوگ جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کیفے میں تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دُور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا "یہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی"۔ زندگی کا پہیہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیئے گئے دس منٹوں نے حبیب کو کچھ ایسا خراج ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سربراہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن حبیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اُترا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ حبیب صاحب اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ بیس برس کا جمع پانی اُن کی آنکھوں سے نکل کر سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بقول اُن کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں سے بلاوا آ ہی گیا تھا، جہاں جا کر وہ ماتھا ٹیک کر تب تک نہ اُٹھتے، جب تک انہیں اپنے پچھلے ہر گناہ کی معافی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ پُراسرار بندے جو عمر کے چوبیسویں سال میں نیویارک کے ایک چوراہے پر اُن سے ملے تھے، وہ

انہیں پہلے کیوں نہیں ملے.........؟ وہ اس کے پیارے حبیب ﷺ کے روضے کی جالی سے اپنی جبیں ٹکا کر تب تک رونا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی آبِ زم زم کی طرح میٹھا نہ ہو جائے......... میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب بپھرتی جا رہی تھیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریسٹورنٹ کی گھنٹی بج چکی تھی اور اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ حبیب صاحب تیسری منزل کے مہمان تھے، لہٰذا انہیں اُسی ریسٹوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ رحمٰن صاحب نے بنا مجھ سے پوچھے ہی جہاز کے سب سے اعلیٰ حصے کے ٹکٹ کروا لیے تھے۔ مجھے جہاز کا اطالوی عملہ دو مرتبہ آ کر یاد دہانی کروا چکا تھا کہ کھانا نیچے ریسٹوران میں چُن دیا گیا ہے۔ حبیب صاحب بھی نیچے جانے کے لیے پلٹے۔ اچانک میں اُن سے پوچھ بیٹھا ’’کیا وہاں پہنچنے تک میں آپ کو یاد رہ پاؤں گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ میرے لیے اُس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں اور اُس جالی کے سامنے بھی، اگر آپ کو یاد رہے تو.........؟‘‘ حبیب صاحب تڑپ کر پلٹے ’’ہاں ضرور......... کیوں نہیں......... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی خاص دعا کروانی ہے تو وہ بھی بتا دو.........‘‘ میں کچھ دیر خاموش رہا ’’ہاں......... بہت خاص......... دعا بھی کیا ہے، بس ایک پیغام ہے کہ آپ نے اسے صرف چالیس دن میں پا لیا، میں چالیس صدیاں بھی ریاضت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے مکمل دیوانہ کرنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے فرزانگی عطا کر دے۔ وہ فرزانگی، جو میری آنکھوں پر پڑے سب پردے اُٹھا دے۔‘‘ جانے حبیب صاحب کو میری بات سمجھ بھی آئی کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر نم آنکھوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے ’’انشاءاللہ......‘‘

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریسٹوران میں پہنچا تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی وردیوں میں چاق چوبند بیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو دوشیزہ بیٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دھیمے سُروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد اور اناناس کی چند قاشیں رکھیں اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک رہی تھیں، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاد اُن کے لباس اور پھر زمین پر بکھر گیا۔ اُن کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے بنا میری معذرت سُنے انگریزی میں مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں، حالانکہ غلطی بھی اُن ہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کرتے کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی نچلے عملے ہی کا کوئی رُکن سمجھی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ ’’جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں احمق لوگ۔ جنہیں ریسٹوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ، ابھی.........۔‘‘ وہ بنا وقفے سے چلائے جا رہی تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اٹینڈنٹ بدحواس سی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی ’’وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے......... اُن کی حالت بگڑ رہی ہے.........‘‘

◆……◆

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

کاسابلانکا

یہ سنتے ہی میں اُس عورت کو چیختا چلاتا چھوڑ کر اپنے کیبن کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی طبی ٹیم کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ''کیا ماجرا ہے؟'' ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اُٹھایا۔ ''عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبرانا معمول کی بات ہے، لیکن چونکہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آ رہے تھے، لہٰذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظامِ تنفس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال......... ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیبن ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً اُسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر.......... '' فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اُس نے مجھے خودکار گھنٹی کا ریموٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ بٹن دبا دوں تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیبن کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر ٹکا لی۔ جانے کتنی دیر میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی نلکی میں پانی کے بلبلے بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا......... وہاں ختم......... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجیہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اُس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ ''اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں عبد اللہ ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' وہ کچھ ہچکچایا۔ ''دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈائننگ ہال میں تم پر بلاوجہ چلانے والی میری بیوی نتاشا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اُس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اُس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں درحقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں''۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ ''بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے''۔ ''نہیں......... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن نتاشا خود شدید ڈپریشن کا شکار ہے اور اس نے جانے کس بات کا غصہ تم پر اُتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔'' میں نے اُن کا تاسف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ''آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں میں ڈائننگ ہال سے نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی میں وہاں سے نکلنا پڑا۔'' ''ہاں مجھے پتہ چلا

ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟'' ''کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیبن ہے۔ میرا کیبن ساتھ والا ہے۔'' اتنے میں عملے کی ایک اٹینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مؤدب انداز میں راحیل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ''جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سویٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیبن خالی نہیں ہے، لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں۔ البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیبن فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو اسے آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔'' راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اٹینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل صاحب سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیبن میں بھی گزار سکتے ہیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت ہے۔'' راحیل صاحب ہچکچا سے گئے۔ ''نہیں، نہیں .... کچھ انتظام ہو جائے گا، آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں''۔ لیکن میں نے اصرار کر کے اپنے کیبن کی چابی اُن کے حوالے کر دی۔ اور خود سلطان بابا کے کیبن میں چلا آیا۔ رات کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ والے کیبن میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں اُبھری ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ اَن بن چل رہی ہے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے دو مرتبہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب واقف تھے۔ صبح کے بعد اُن کی نیند کچھ پُرسکون ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اُسی وقت راحیل صاحب بھی ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ''رات میں ٹھیک طرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ نتاشا نے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے درمیان تمہارے معاملے پر ہی کچھ اَن بن ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنا کیبن چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے کیبن سے یوں چلے آنے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اُسی نوجوان کے کیبن میں ہوں، جسے اُس نے بھرے ہال میں سخت سست سنائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اتنا شرمندہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیبن واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال، تمہارا بہت شکریہ''۔ انہوں نے کیبن کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں اُن سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک بڑی لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں نیچے ڈائننگ ہال پہنچا تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور باہر آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے چکنے فرش پر دھوپ کی درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راحیل صاحب نے آواز دی۔ ''یہیں آجاؤ نوجوان .... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے ....'' لیکن میں نے دُور ہی سے ہاتھ ہلا کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کے جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیہ کا پیالہ رکھ دیا۔ تب ہی میں نے نتاشا کو میز سے اُٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک دل کش خاتون تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جو فلیپر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے اُن کے چہرے کے ایک زاویے سے کبھی کے

ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیتھرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راحیل صاحب بھی مجھ سے اُردو میں ہی بات کر رہے تھے لیکن نتاشا کو اُردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر انہیں یہ ”ناکام کوشش“ کرنے دی اور پھر دھیرے سے اُن سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں تو اب یہ کوشش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی ندامت سے بولیں۔ ”اوہ.......... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راحیل نے تو بتایا تھا کہ.......... پھر تو میں مزید نادم ہوں، کیونکہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کسی پر اس طرح نہیں چلائی۔“ میں مسکرایا۔ ”چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شوہر کا نصیب ہوتا ہے۔“ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور اُن کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر کم ہو گیا۔ ”ویسے تم عجیب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سرِ بازار رسوا کیا، اُسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا کیبن پیش کر دیا۔ کیوں؟..........“ میں نے اُن سے بھی وہی کہا جو رات کو راحیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب فراموش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نو بیاہتا انگریز جوڑا ناشتہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ ”سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہو نا“۔ لڑکی نے ہنستے ہوئے زور سے ”ہاں“ کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اُن کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ نتاشا مسکرائی۔ ”کتنی عجیب بات ہے، برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اُس کے پاس ”ہاں“ کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا“۔ ”ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پیٹتے ہوئے یہ سوال کرے گا؟“ میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں۔ لیکن اُن کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فسانہ سنا رہی تھیں۔ میں نے اُن سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راحیل صاحب کا اُن کا جھگڑا ہوا۔ وہ جلدی سے بولیں ”نہیں، نہیں.......... ایسی کوئی بات نہیں.......... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن پہلے ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اُتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں گے“۔ میرے اندر جیسے ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری حالت بھانپ گئیں۔ ”شاید میں نے تمہیں دھچکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان جمود طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے وہی حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر وہ آدابِ گفتگو کی زنجیر آڑے تھی۔ ”ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی حرمت کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ اُن کی خوش قسمتی ہے یا حرماں نصیبی۔ لیکن شاید یہ رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آملیٹ کو کانٹے سے اِدھر اُدھر دھکیلتی رہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ”جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی تمہارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔“ میں نے تردید مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیبن میں اُن کے سرہانے بیٹھا رہا۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور

وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر پہنچتے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے ذہن پر اُس پری کا تصور اُبھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی، جانے میں اُس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ میری سانسیں تو اُس کے تصور سے ہی تھمنے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اُسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمٰن صاحب کے ذریعے اپنے گھر واپسی کی اطلاع کروا چکا تھا اور یقیناً مما پاپا نے زہرا کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرہ گاہ میں لنگر انداز ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود وصل کی لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سویرا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عرشے پر بچھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اس اُفق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے وہ زہرا جبین رہتی تھی، اور انتظار کی اُسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب سے نتاشا کی آواز سنائی دی''۔ کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟'' میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راحیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نتاشا نے بات شروع کی۔ ''تم نے کبھی محسوس کیا، ہماری زندگی کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہونِ منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بحری جہاز تک، کوئی بھی ایجاد اُٹھا لو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسائشوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیسہ کہتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.........اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا Creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے جبکہ ''آرٹ'' انہی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔'' نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانو تو.........تمہارا یہ حلیہ اور تمہاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟'' میں مسکرایا۔ ''اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید اُلجھ نہ جائیں.........آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔'' نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ ''صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہٰذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو آخری چناؤ اُس کے ہاتھ ہی میں ہوگا''۔ نتاشا نے جتنی بار اپنا گھر ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا، میں نے اُن کی آنکھوں میں ایک خاص دُکھ کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی چبھن شاید یکساں ہوتی ہے۔ ''میں جانتا ہوں شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا پھر اُن کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ ''وفا.........ہماری جدائی کا سبب وفا ہے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ''جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد

تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے، یہ تیسری ''دراندازِ محبت'' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنتی گئی۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر وا کروں۔ میں نے اُسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں۔ اور یہ راحیل ہی کا اعلیٰ ظرف ہے کہ اُس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اُوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں ہی محبت میں ''تجدیدِ وفا'' کے قائل نہیں ہیں.......... اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے ''تجدید'' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور محبت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فی صد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے، لیکن افسوس میرا مقدمہ 100 واں تھا۔'' میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی اچھے سامع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ اُن کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح اُن کی پہلی ملاقات سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل پاکستان سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شاندار شخصیت، متانت اور سمجھداری کے امتزاج نے جلد ہی مشکل پسند اور سچی نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ کے کورس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی، دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمان بندھ چکے تھے تو راحیل نے اپنے گھر والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیونکہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔ ماں نے بیٹے کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہو گئی۔ دونوں کا شعبہ ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ جچتا تھا، لہٰذا رہائش وہیں رکھی گئی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی عینی کی پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اُڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاں بس، دونوں میں کبھی ہنستے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول کو ہی محبت کی معراج سمجھتا تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت کے جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور پر لیتی تھی اور یہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہو گئی اور فرہاد اُن کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی مصور، جس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ اصرار کے باوجود راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی۔ جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک ساتھ ہر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ واپس آ کر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات بھی بانٹا کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ ''ان ہونیاں'' سدا ہی سے ہماری تاک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک عظیم شاہکار، نتاشا پینٹنگز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری کسک تھی، ہر تصویر میں، رُوح میں سے رُوح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی۔ وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ ''کھوج.......... اس تصویر کا عنوان کھوج ہے.......... لاحاصل کی

کھوج.......... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور اس پیارے کے لیے چھلنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو جو اُسی کے سامنے شدید پیاس سے دم توڑ رہا ہو یا میدانِ جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اُس کے کسی وفادار سپاہی کا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا.......... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس تصویر میں..........'' نتاشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتداء تھی، جس کی انتہاء آج میرے سامنے کاسابلانکا کے عرشے پر موجود تھی۔ شروع کے چند ہفتے تو نتاشا کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ کشش فرہاد کے فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راحیل کو بھی اگلے ہفتے نمائش دکھانے لے گئی اور راحیل نے بھی فرہاد کے فن کو خوب سراہا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ انجانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی بڑی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار ہے، کیونکہ نتاشا نے کبھی اُسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ نتاشا اس لیے بھی شدید اُلجھن میں تھی، کیونکہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔ لیکن کیا کبھی محبت کو کسی وجہ کی ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہونِ منت ہوتی ہے؟۔ نہیں.......... دل کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے.......... کہ دل کب کسی کا دوست ہوا ہے..........

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ایک محبت اور سہی

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، اُدھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا
میں کوشش کر کے اب خود بھی سنور جاؤں تو بہتر ہے

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالانکہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ گیلری میں گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اُس جانب کا رُخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پرسکون زندگی، ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ محبت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں، اگر یہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا تو طوفان آجاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح یک طرفہ اور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی۔ لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا ایک اطالوی نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں۔ اور پھر اُسے اب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر بھی کرسکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی حرمت ہی کھو دے۔ اپنا وقار اپنی گریس ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم قائم رکھا۔ جس کے سامنے اس کی متاعِ حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی بچانے کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں اُترنے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے کے باوجود اپنی گم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تاوقتیکہ اُس نے راحیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راحیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں دیکھ پائے گا۔ اُس نے نتاشا

سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راحیل کو یوں لحہ بہ لحہ ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو، اُس نے خود ہی اپنی فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جدائی کی سزا۔ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے تو وہ اصل میں ملزم کو اُس کے پیاروں سے عمر بھر کی جدائی کی سزا ہی تو دے رہا ہوتا ہے۔ تو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی "عمر قید" چن لی تھی۔ راحیل نے نتاشا سے یہ بھی پوچھا کہ کیوپڈ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور جرم کی سرزدگی بھی اُسی کے دل کے سر ہے تو پھر سزا راحیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور بھرتا کوئی اور.......... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالانکہ اب اُس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی۔ اور وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا لیکن نتاشا نے راحیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا ظرف اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راحیل کی ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی اور پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے تو پھر سے روتی دھوتی راحیل کی زندگی میں واپس آ جائے۔ لہٰذا اس نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے راحیل کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ اُن کی علیحدگی کی وجہ خود اُسی "مردِ مغرور" کے ہاتھ سے کینوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینٹے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے والی ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری محبت میں "مبتلا" ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں ساتویں عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شبیہ دیکھ لے تو گھبرا کر خود ہی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑے کا سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تلتا ہی نہیں، لیکن نتاشا نے مغربی ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم رکھنے کی یہ انوکھی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راحیل سے علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا۔ کیونکہ یہ جوا تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط ہی نہیں تھی۔ راحیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے فرہاد کی آرٹ گیلری چھوڑ آئے تاکہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ کہیں مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راحیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی طبیعت پاکستان میں مسلسل بگڑتی جا رہی تھی اور اُس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے، کیونکہ نتاشا شادی کے بعد سے اب تک راحیل کے وطن نہیں جا پائی تھی۔ لہٰذا راحیل نے اُس سے اس آخری "ہم سفری" کی درخواست کی اور طے پایا کہ راحیل کی ماں سے ملاقات کے بعد خاموشی سے وہ دونوں جدا ہو جائیں گے اور اس کی خبر راحیل کی بوڑھی ماں کو کبھی نہیں ہو پائے گی، کیونکہ وہ یہی سمجھتی رہے گی کہ اُس کا بیٹا اور بہو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے ہیں۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا لیکن میں اُس رات لحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ کیا محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں پلٹتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل

کے کواڑ دوسرے پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری “آخری محبت” ہوتی ہے۔ کیا “محبت” اور “وفا” کے معیار بھی ہمارے معاشرتی اقدار کے تابع ہوتے ہیں؟ اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ بیٹھتے۔ جانے اس “محبت” نامی معمے کی کتنی پرتیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات بھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے اُن کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید بگڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اُس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگتا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر جھٹک کر اُٹھ کے ٹہلنا پڑا۔ نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ لہٰذا میں اپنے کیبن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس اُن کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راحیل صاحب کھڑے تھے۔ “میں مخل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔” “جی۔۔۔۔۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی اس وجہ سے نیچے نہیں آسکا۔” انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا تھا۔ اُنہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر کھلی فضا میں رہنا چاہیے تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے تپتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں جہاز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتلے تختوں سے ایک اُونچے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ آس پاس سفید وردی پر نیلی لکیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سیلز مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راحیل صاحب نے دُور بجتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ “جانتے ہو یہ ملاح اس اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟” میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ “یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اُونچے کر لو۔ پتوار اور تیز چلاؤ، کیونکہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے۔۔۔۔۔ ہمارا ساحل دُور ہے اور کپتان کی محبوبہ پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔” “آپ کو اطالوی آتی ہے؟” “ہاں۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں۔۔۔۔۔ نتاشا کے گھر والوں کے سامنے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے مجھے۔ وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی جلتی ہیں۔” میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ “کیا بادبان اُونچے کرنے اور پتوار تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جا سکتا ہے؟” انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ “نہیں۔۔۔۔۔ طوفان تو آ کر ہی رہتے ہیں، لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندر کو ویران بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے انہیں طوفانوں سے کیا گلہ...... گر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو پھر سکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔ شور مچا کے اور واویلا کر کے سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اُن کے چہرے ہی سے اُن کے اندر اُٹھتے طوفانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹٹولا “آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں۔ جو ڈوبنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہ طوفانوں کا رُخ بھی تو موڑ سکتے ہیں”۔ وہ مسکرائے۔ کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ “وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہو سکتا ہے، جرم نہیں۔ اور محبت جرم تب بنتی ہے جب وہ اپنے ساتھ احساس جرم لے کر آئے۔۔۔۔۔ اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آ جانے سے

میری محبت پر کوئی فرق پڑے تو پھر یہ محبت نہیں "سوداگری" ہوئی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے، اُتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسا یہ زہر نچوڑ نہیں سکتی"۔ "تو پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جوا کھیلنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول نہیں کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اُٹھانے پر صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر مگن ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کب کسی کا انتظار کرتی ہے؟" میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ تلخ اور بلند ہو گیا تھا، تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم پر خشمگیں سی نگاہ ڈالی۔ راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے۔ "جوا نتاشا نے کھیلا ہے، لیکن بازی میں نے بچھائی ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اُس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ دو دن بعد ہم جس بندرگاہ پر اُتر رہے ہیں وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا"۔ میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ کھینچ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں دھڑام سے سمندر سے جا گرا ہوں۔ راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے تھے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُسے آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، نتاشا کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہٰذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نتاشا سے لڑنا چاہتی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اُسے بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا دے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی ان بن اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راحیل نے سونیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا راحیل سے کیوں جدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے تو وہ نتاشا کو اپنا لے۔ راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا لیکن خود انگاروں پر لوٹتا رہا۔ دنیا میں بھلا کون ہوگا، جو کسی لٹیرے کو خود مدعو کرے کہ "آؤ اور میری متاعِ حیات لوٹ کر چلتے بنو"۔

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آ کر یہ بتایا کہ پہلے پہل تو فرہاد اُن کی جدائی کے صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا کیونکہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اُسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی تھی، پھر اُس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اُسے سمجھا سکتا ہے، لیکن جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی تو اُس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنانا اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا۔ شاید کہیں دُور اُس کے دل میں اب بھی یہ اُمید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے، مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ نتاشا کو اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اُسے بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا۔ البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام شاید اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے دل میں دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں گڑھا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب سے بھی

ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ اُن کے ساتھ جانے والے کبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازی طبیعت کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب اُن کے جانے کا وقت ہوا تو مجھے اُوپر والے چوبی ڈیک پر جہاز کے آخری ریلنگ کے پاس نتاشا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اُونچائی پر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے بیچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر اُن کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ”کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ تو نہیں کر رکھا؟“ وہ مسکرائیں ”نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دُعا نہیں رہی..........۔“ ”ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گنتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟“ ”نہیں.......... میں ابھی محبت کے ”م“ اور عشق کے ”عین“ تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے“۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”کیوں؟“ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا ”آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لاحاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالینے کے بعد پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کمند کو نئی فصیلوں پر اٹکنے سے نہیں روک پاتے تو پھر ہم ایک نیا کلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟“ نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”کیسا کلیہ؟“ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ”یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی پلٹ سکتا ہے تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سردھڑ کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔“ نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی ”لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنا نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میں نے آخری وار کر دیا ”تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نصیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟“ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں وہ تو سدا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا، لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھنچتا محسوس ہوا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے سارے خوابوں پر قابض ہو بیٹھا ہے تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں اُلجھا بیٹھے گا؟“ نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”لیکن تم..........؟“ ”میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے تو پھر ہمارا ایک شاعر صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ ”دل پہ زور نہیں“.......... آپ جس ماحول میں پلی بڑھی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہیولے اُس کا دل کھینچنے کے لیے اُس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر.......... تو پھر آپ کے کلیے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سینکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے، دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد

کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کسی دوسرے کے بنائے ہوئے ہیولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اِسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سلیبر یٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے راحیل کے من کے ہیولے کو ٹٹولا ہے۔ ہوسکتا ہے، خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف پانچ فی صد ہی پورا کرتی ہوں''۔ نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا ''لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ یقین کرو میں اُس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اُس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں''۔ ''کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ..........؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہی گزار دے اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کیا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کس انسانوں کا، جنھیں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی''۔ نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ''پھر ان ہزار صدی کی خواہشوں کا کیا ہوا؟ دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟'' میں نے اُن کی جانب دیکھا ''اگر اس دل نے ہمارے ساتھ ہر حاصل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ''لاحاصل'' رکھ چھوڑنا چاہیے تاکہ وہی ''لاحاصل'' اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح اس دل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے تو پھر یہ بھی اُسی بچے کی طرح چند دن کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل بھر گیا تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھلونے کے لیے مچلنے لگے گا تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے.......... تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے لیے خاص رہے۔

میں نتاشا کو سوچوں کے بھنور میں چھوڑ کر نیچے کیبن میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل بانہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی ایک جھلک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دُور سے میں نے مما اور پپا کو میزبانوں والے حصے کی جالی کے پرے دیکھا۔ اُن کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی لیکن مجھے زہرا کا دھانی آنچل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہار جاتا تھا مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اُس کی بچی عینی اور پھر نتاشا نے آخری سیڑھی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سجے سنورے شخص پر پڑی اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ''فرہاد..........''

* * *

آخری محبت

میں نے بھی نتاشا کی نظروں کی تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اُس کے انداز میں جو ایک خاص لاپروائی تھی اور اُس کے سفید لباس پر جچتی نیلی پی کیپ اُسے دُور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ سب ہی تخلیقی کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نتاشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نتاشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ''فرہاد............تم............ یہاں............؟'' فرہاد مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا ''ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سرپرائز دے کر حیران کر دوں۔'' نتاشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نتاشا سے کہا ''چلیں............ آپ کا کام آسان ہو گیا۔ لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جبکہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سپنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔'' اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ''عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے، نتاشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں، میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جُدا ہیں۔'' نتاشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے۔ اُس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اپنی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اُس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے عینی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اُٹھائے۔ عینی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جمے دیکھا اور پھر اُسے جاتے جاتے آواز دی۔ ''مما............'' نتاشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور جلدی سے پلٹ کر چلائی۔ ''رُک جاؤ راحیل............'' راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نتاشا تیزی سے میری جانب بڑھی ''کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو۔ تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی ''آخری محبت'' بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے سمندر نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کمند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فصیل پر ہر بار اپنی کنڈی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ۔ اس ''تجدیدِ وفا'' کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، لیکن تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے۔ کیونکہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔'' میں نے مسکرا کر اسی نئی نتاشا کو دیکھا۔ ''ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درزوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی

ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے لیے ایک آفتاب ہی کی روشنی میسر ہوتی ہے، لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلسنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے.......... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" نتاشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دُور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نتاشا پلٹنے سے پہلے فرہاد کی طرف بڑھی۔ "تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے جانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ، اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور عینی نمائش دیکھنے ضرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹریٹ بھی لیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔" نتاشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور فرہاد کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دُور جا کر اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اُن کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے پلٹ گیا۔ اُسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اُترا ہی تھا کہ پپا کی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ "ساحر.......... ہم یہاں ہیں.........." پپا کے ساتھ مما بھی کھڑی تھیں لیکن اُن کی آواز ان کے بہتے آنسو پہلے ہی گھونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر اُن کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریباً چھ ماہ کے بعد اُن سے مل رہا تھا اور مما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی اُن کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایمبولینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید سینکڑوں بار اُس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس ناز آفریں کو آنا تھا، لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ ہجوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ مما پپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے مما سے پوچھ ہی لیا کہ زہرا کیوں نہیں آئی؟ مما نے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اسی دن زہرا کے گھر والوں تک پہنچا دی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا۔ پھر بھی زہرا میرے استقبال کو نہیں آئی.......... کیوں؟

سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خود ہی سوال اُٹھتے رہے اور میرا نادان دل خود ہی ان وسوسوں کے جواب اور جواز تراشتا رہا۔ ہو سکتا ہے، اُسے ٹھیک خبر ہی نہ ملی ہو۔ یا ہو سکتا ہے وہ کہیں بھیڑ ہی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلتے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سر اُبھارتا تو میرا سودائی دل اس کے سو عذر تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت ہمیں کتنے بہانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرہ گاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عرشے پر کھڑے حبیب البشر

صاحب سے ملنے کے لیے اوپر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگائے تھپکتے رہے اور میرے شانے اُن کی پلکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے بولے ”ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں تو وہ ہماری جانب ستر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اُس کے بہت قریب ہو۔ میں جتنی بار بھی اُس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا، میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلے گی اور مجھے یقین ہے ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔“ میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب ایمبولینس اسپتال کے ”انتہائی نگہداشت“ کے شعبے کی پارکنگ میں جا کر رُک گئی۔ مما پپا بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے غنودگی کے عالم میں ایک دو بار مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثر تلے اُن کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معالج کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے گھر سے تازہ دم ہو آؤں، تب تک وہ اسپتال میں ٹھہرتے لیکن میں نے منع کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی مما کو گھر واپس بھیجا، کیونکہ انہیں اسپتال کے ماحول اور اردگرد ہوتی اَن ہونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنبھلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے گھر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادلِ نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتیں وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سودا ہے، جو سود در سود ہر پل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہان کا یہ واحد اُدھار ہے جس کی ادائیگی کیے بنا ہی ہم سب یکے بعد دیگرے الوداع کہتے جاتے ہیں۔

مما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقفے سے مناسب الفاظ میں پپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بتا دیا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ سہل انداز اور تسلی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا سے گئے۔ اگر سلطان بابا کی طبیعت کا خیال نہ ہوتا تو وہ اُسی وقت مجھے بھی اِسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ پھر بھی جب تک میں نے اُن سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنے خود انہی کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے اور راہداری ہی میں ٹہلتے رہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے گھر میں تھا اور مما پپا کے لاڈلے کے طور پر اُن کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پپا کے اندر سلطان بابا جیسی بزرگانہ جھلک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماتھے پر بل ڈالے، بڑبڑاتے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے ٹہلنے والا یہ شخص مجھے اپنا پپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے احساس بھی ہوا کہ بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ ”بزرگ“ کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ سوا ہوتا ہے۔ پپا ہی نے مجھے میرے جگری دوست کاشف کے بارے میں بتایا کہ وہ ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے چینی سے خوب واقف تھے، لہٰذا مختلف بہانوں سے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرا جبیں کی پلک کے خم میں اٹک چکی تھی، اُسے شام ڈھلے تک اُس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھربھرے ہوتے نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی، تو پھر بھی اب تک اُسے مجھ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اُترے سات گھنٹے ہو چکے تھے لیکن اُس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقعہ، کوئی سندیس تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل ماہی کے مجذوب کی آواز گونجی ”جا…… تجھے خدا ملے گا، نہ ہی وصال

صنم........" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ٹھیک اُسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کر کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر اُن کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند سے تھے " آپ اُن سے مل سکتے ہیں........ لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر گہری چوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں ہیں۔ بہر حال مایوسی کفر ہے........ ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا"۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پپا کمرے میں داخل ہوئے تو آہٹ سن کر بابا نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے۔ لیکن اُن کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔ "تم نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نا میاں........ اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالانکہ ان کے ہاتھ میں شفا تو ہو سکتی ہے، لیکن "جزا" نہیں۔ قضا اور جزا کا اختیار صرف اُس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں لکھوا کر لائے ہیں وہ تو بہر حال کاٹنی ہیں۔" میں نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ "بات اگر سانسوں کی گنتی کی ہے تو پھر مجھے وہ کلیہ بھی آج بتا ہی دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانسیں بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا سکوں۔" انہوں نے میری بھیگی پلکیں پونچھیں۔ "زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں بانٹی جاتی۔ تم نہیں جانتے تم مجھے کتنی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے منسلک نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہوگا تو دوسرا شروع ہو جائے گا"۔ پپا نے دھیرے سے میرے کاندھے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان بابا کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھتے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ "بزرگ دانش" بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلتے بنیں گے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک تیماردار ہی وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے مما سے کیا گیا وعدہ بھی یاد تھا۔ سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مانوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوشبو........ وہی مما کی اپنی اپنی سی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لپٹی بیلیں۔ شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا تو اُسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اُسی طرح "بکھرا" ہوا تھا جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید مما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفیومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوٹس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر........ سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کف لنکس اور ٹائی پنز بھی اُسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرا کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کی بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو۔ لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اُٹھایا گیا۔ زہرا موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ مما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کسر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔

مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہو آتے ہیں لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر ویسے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں اندر تک جھنجھنا اُٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سنتے ہی مما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کیا.........اوہ.........اچھا.........جی جی.........لیکن کس اسپتال میں.........اچھا ٹھیک ہے.........'' مما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی ''زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے''۔ میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ مما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا تو اُسے بھی زہرا کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اُس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرا کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نوجوان کی نبضیں ابھی چل رہی تھیں۔ لہٰذا لوگوں کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اُسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرا سمیت اُسے لے کر قریبی اسپتال کی طرف گاڑی بھگا دی۔ یہ فون وہیں سے زہرا کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرا گھر سے نکلی تھی، تب تک وہ اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے تو اس افتاد کا سنتے ہی وہ زہرا کی اماں کو لے کر فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نوجوان کسی اُونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرا کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیونکہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن مما کے بقول زہرا کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ''یا میرے مولا.........اُس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا''۔ ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور اس مرتبہ میں نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں، لہٰذا انہیں پھر سے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ غنودگی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں مما پپا پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورتِ حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرا لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں پھر سے وہی اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور پھر میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے ڈاکٹر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ ''کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اس نظام کو متحرک کر سکتی ہے جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔'' افسوس وہ نظام متحرک ہوا بھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھیراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔

''ساحر.........خود کو سنبھالو بیٹا.......... ''لیکن میں شاید بہت پہلے سنبھلنے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں نے مما کو چیختے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا، لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی سپنا تھا۔ ایمبولینس کی گھومتی سرخ بتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کا سائن بورڈ، سفید گاؤن پہنے اور میرے اسٹریچر کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھیٹر کی ایک جھٹکے سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ چمکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری کنپٹی کی بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی چبھن اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس......... اور پھر وہی سرخ اندھیرا......... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں......... ہمیں افسوس ہے......... آپ کے بیٹے کے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں تو اسے فوراً لندن کے روز ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید اب کچھ کر سکتے ہیں''۔ پھر مما کے رونے کی آواز، ایئر پورٹ ٹرمینل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہیوں کی رن وے پر رگڑ سے اُڑتی چنگاریاں، اور پھر ایک ملائم آواز ''ہم لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں''۔

❁……❁

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”من کی دیوار“

عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں کہ یہ سورج کدھر سے نکلا تھا
یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا
یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لبِ چارہ گر سے نکلا تھا
میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا
وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فرازؔ
تیری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

سچ تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش وحواس تب میرا ساتھ چھوڑ گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھونے کو رہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا تھا، لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔ اس کا مقدر تو صرف اُسے چھونے کی خواہش میں اُڑتے جانا ہے۔ اُونچا اور اُونچا تر، حتیٰ کہ اُس کی سانسیں رُکنے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے آخری قلابازی اور پھر سب ختم .... شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔ جھپکتی گھڑیوں کے چند لمحے مجھے ایک بہت بڑی سی شیشے کی کھڑکی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے پرے مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے کنارے بچھے بینچوں پر اس سے باتیں کرتے گزارے تھے۔ ہاں .... شاید یہ دریائے ٹیمز ہی تھا۔ میں اس کی دھیمی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ وقفوں سے دھیرے دھیرے میرے پپوٹوں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اُٹھانے میں کامیاب ہوا اور سب سے پہلے جو شبیہہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے

پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جائے نماز پر سجدہ میں پڑی ہوئی، میری ماں کی تھی۔ ہاں.........وہ مما ہی تھیں، جن کی جبیں نے ماتھا ٹیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ کھڑکی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا سکھا ہی دیتی ہے۔ میری پلکیں اُٹھتی دیکھ کر پپا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ مما بھی وہیں جائے نماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے تو میں نے کیلنڈر پر مزید تین ہندسے بڑھے ہوئے دیکھے اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں پورے پندرہ دن تک اس سوتی جاگتی حالت میں بنا جیے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک ہجوم جمع تھا جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا "ہیلو لڑکے.........میرا نام البرٹ ہے ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو"۔ مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پپا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چبھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ "تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوند بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ریبیز کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے منہ سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں"۔ وہ میرے گال تھپتھپا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لکنت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ پاپا نے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کومے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے پپا کی بات ادھوری سی لگی، لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر پڑا تھا کہ خود اُٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی میرا اُن سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دریائے ٹیمز کی رواں لہروں میں ضم ہو کر فنا ہوتی بوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات (میڈیم) عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے۔ گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ سوا ہی ہوتا ہوگا، کیونکہ ہم اپنی ساری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے اجنبی رہتے ہیں، کتنے جدا اور کتنے الگ سے۔ کہیں ہمارا میڈیم وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کمرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین نما ٹی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ پپا وقت گزاری کے لیے مختلف چینلز بدل رہے تھے اور پھر ایک لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا دیا۔ پپا تب تک تین چار مزید چینل گزار چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل پلٹنے کو کہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹ دیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر انہیں رُکنے کو کہا۔ ہاں.........یہی وہ چینل

تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان میں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ہر ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا ہو۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک وہی تھا، جب حبیب صاحب کی پہلی نظر اُس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے……… جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پتے کی طرح لرز کر چند گھڑیوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس مساموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور جب رواں رواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا۔ تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مغرب میں ڈاکٹر اب ساری عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ اَن ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج قرار دے کر میرے لیے ساری عمر مدہوشی یا جنون کے عالم میں مبتلا رہنے کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک پل میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ Miracle (معجزہ)……… اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اب ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ ”سانس کی آمد و رفت“ سے بڑا بھی کیا کوئی ”معجزہ“ ہوگا اس دور کا؟ اُس کے گھر سے ہزاروں میل دُور بیٹھ کر بھی جب اُس کے حضور مانگی گئی دعا پلک جھپکنے سے پہلے اُس کی بارگاہ میں پہنچ جاتی ہے تو پھر اُس کی چوکھٹ کو چومتے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی ہوں گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق ریبیز کے کچھ جرثومے ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحیح وقت پر ویکسین دیئے جانے کے باوجود عین موقعے پر اپنے آپ کو کسی سیپ نما چادر میں چھپا کر خود پر کوئی ”جھوٹا خول“ چڑھا لیتے ہیں، لہٰذا ویکسین کے خلیے اُسے پہچان نہیں پاتے اور اُس پر اثر ختم ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے بچے کھچے اور دم توڑتے خلیوں پر ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق جب مجھے لندن کے روز ویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 فی صد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا قبضہ کر چکی تھی اور ایسے مریضوں کا زندگی کی طرف لوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو واپس پا لینا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، لیکن اُن کے سامنے ایک ایسا مریض موجود تھا، جس کے تھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کمزور اعصاب کی فصیل پر ٹکا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا۔ لیکن جدید ایلوپیتھی اور سائنس اس معمے کو کبھی نہیں سمجھ پائے گی۔ سچ ہے، انسان سدا سے خسارے میں ہے۔ سدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلتے اور چاند تارے ڈوبتے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، یہ آسمان……… بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے ”دلیل کے سوداگر“ کو مطمئن کرنے کے لیے………؟ لیکن میرے اندر پھیلتی بے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پندرہ دن سے زہرا سے مما پپا کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ لیکن مما کچھ کھٹکی ہوئی سی لگتی تھیں، جیسے زہرا کا ایسی حالت میں مجھ سے لاتعلق رہنا انہیں پسند نہ آیا ہو……… تب ہی شام کو میرے حلق میں سوپ کے چھوٹے چمچ انڈیلتے ہوئے اُن کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ ”کون بے وقوف ہوگی، جو موت کے منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آئے گی یا اُس کا انتظار کرے گی………“ پپا نے نظروں نظروں میں مما کو ڈانٹا۔ وہ بڑبڑا کر چپ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال کلبلانے لگے۔ وہ میری

حالت جاننے کے باوجود ائیر پورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری خیریت تو پوچھ سکتی ہے۔ کہتے ہیں محبت وسوسوں کا آئینہ ہوتی ہے، جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں کوئی نیا وسوسہ کچھ الگ ہی خدشہ سر اُٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے مل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار پلٹ کر نہ دیکھے تو دیوانوں کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ رُوٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی بات بُری تو نہیں لگ گئی اُسے......... ؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا چین و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی جسم کی لاچاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرواز کیوں نہیں عطاء کی گئی؟ ایسا ہوتا تو میں اُڑ کر اُس بے پرواہ کے در جا پہنچتا کہ اس تغافل کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب میں بے ہوش تھا، خود کو اُن کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس خرد نے انہیں مجھ سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز رشتوں سے جسمانی طور پر دُور ہوں تو ہمارے اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں رُوحانی طور پر ان کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نرس بیساکھی اور وہیل چیئر کی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، باغیچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریائے ٹیمز کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سڑک سے ملحق تھا۔ میں جانے کتنی بار اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیونکہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت، ہر خزاں مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے، لیکن میں نے یہ کبھی سوچا تھا کہ میں کسی دن اس شکستہ بدن کے ساتھ اس سڑک کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ملوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا مقام ہم پر کس وقت، کس صورت میں کھلے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی ہماری دوستی بھی نہ ہو پائے۔ اس روز بھی میں وہیل چیئر پہ بیٹھا اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں بکھرے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے ننھے ستاروں کو اپنے موتی ٹانکتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی ہی سوچوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے در و دیوار کو سفیدے کی ململ سے ڈھک رہی تھی۔ جہاں برف گرتی ہے وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بدصورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اوڑھنی اُڑھا دیتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر میرے سیاہ مقدر کی لکیروں کی تلاش شروع کی تو نرس نے میرے منع کرنے کے باوجود وہیل چیئر کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اُٹھائی۔ گیروے رنگ کا چولا پہنے، ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر عام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے ایک پکی عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند تھی۔ جیسے گرم تپتی دوپہر کا سوا نیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ ٹک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں .... کس قدر چبھن تھی اُس کی نظر میں۔ میں ایک پل ہی میں لہولہان ہو گیا۔ ”مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈ مین ہے اور میں آسٹریلین نژاد یہودی ہوں۔“ مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی تلاش ہے لڑکے......... نرس گرو نامی اس

پُراسرار شخص کو دیکھ کر مؤدب سی ہوگئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گرو نے میرے ماتھے پر اپنی دو اُنگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ مجھے لگا جیسے گرم دہکتے الاؤ میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اتنے میں مما نے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں "ساحر برف باری شروع ہو چکی ہے.........فوراً اندر آجاؤ"۔ وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس نور کی برسات کو دیکھتا رہوں، تب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گرو نے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا، لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند میں بھی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چبھتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دودھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا دریائے ٹیمز اور دُور نظر آتا ویسٹ منسٹر کا پل بھی برف سے بنا سانچا لگ رہا تھے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برفیلی صبح سے زیادہ سحر زدہ اور مبہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسی برفیلی صبح کے بعد اپنی رُوح پھر سے ایک نیا جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا باہر بنے نور کے مجسموں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور گرو اپنے مخصوص حلیے میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مما تو اسے دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اُس نے شستہ انگریزی میں سب سے معذرت کی کہ وہ صرف میری خیریت دریافت کرنے آیا ہے۔ پاپا اُس کا مدعا سمجھ کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور مما کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ مما مجھے اس شخص کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی لیکن پپا نے اپنی آدھی زندگی اسی ماحول میں گزاری تھی اور وہ یہاں کے آداب سے واقف تھے، لہٰذا بادلِ نخواستہ مما کو بھی ساتھ ہی اُٹھنا پڑا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا "مسلمان ہو.........؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "الحمد اللہ.........." گرو چونک سا گیا۔ خود مجھے اپنی اس بے ساختگی پر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ اندازِ افتخار پہلے تو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ شاید اُس کے سوال ہی میں کچھ ایسا پوشیدہ تھا کہ میرے اندر سے خود بہ خود یہ آواز باہر نکل آئی "کیا نام ہے تمہارا؟" "عبداللہ"۔ کچھ دیر تک میں کھڑکی سے باہر اور وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ "پورے روز ویل اسپتال میں تمہارے عجیب تر مرض اور پھر عجیب ترین شفا کا چرچا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اسے حسبِ معمول کسی معجزے سے تعبیر کر رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آج کل معجزے اتنی آسانی سے رُونما نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ضرور کچھ راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھے وہ راز بتاؤ گے.........؟" میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ گُل لپٹی رکھے بغیر اُس نے اپنے دل کی بات پہلی باقاعدہ ملاقات ہی میں میرے سامنے رکھ دی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ شخص بہت خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا "معجزے ناقابلِ بیان ہوتے ہیں اور بات اگر راز کی ہے تو پھر وہ راز ہی کیا جو افشاء ہو جائے........" گرو نے بے چینی سے پہلو بدلا "ٹھیک کہا تم نے........راز کا واسطہ اخفا سے ہے۔ لیکن یہ معاملہ انسان کی بھلائی کا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے افشا سے کسی دوسرے مریض کی حالت سدھرنے کی ترکیب بھی ہو جائے........" میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن مجھے یوں لگا کہ اُس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے تسخیر کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ "بات اگر کسی کی بھلائی کی ہے تو پھر جان لو کہ میری رُوح پر صرف دُعا کا معجزہ رُونما ہوا ہے۔ ہزاروں میل دُور بیٹھے کسی شخص کے اُٹھے ہاتھوں کے پیالے میں میری مسیحائی کا تبرک ڈال دیا گیا۔ دعائیں تو میرے لیے، میرے اپنوں نے بھی بہت مانگی ہوں گی، لیکن کچھ اعجاز اجنبیوں کے حصے آتے ہیں۔ بس، اتنا سا افسانہ ہے میرا........" گرو غور سے میری جانب دیکھتا رہا، جیسے اُسے میری بات کا

یقین تو ہو لیکن نصف۔ لیکن اُس نے مجھ سے مزید بحث نہیں کی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ پتا چل چکا تھا۔ مغرب میں آج کل لوگوں کا رُجحان رُوحانی علاج کی طرف بہت بڑھ چکا ہے۔ باقاعدہ رُوحانی علاج کے کلینک کھل چکے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے بے چین من اور رُوح کی کسک دُور کرنے کی نیت سے آتے تھے۔ گرو بھی یہاں کا ایک ویسا ہی رُوحانی مسیحا تھا جسے اسپتال کے بعض مریضوں کی خصوصی درخواست پر مختلف اوقات میں رُوحانی سیشن کرنے کے لیے خاص دعوت دی جاتی تھی۔ پارکر نام کا یہ یہودی اپنی شفا کے لیے یہاں بہت مقبول بھی تھا اور بھٹکی رُوحوں کے ستائے جسم اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُس کا یہ حلیہ اور ''گرو'' نام کا لقب اُس کے ہندوستان کے ایک دورے کے بعد کے عطا کردہ تھے، جب اُس نے وہاں بہت سے لوگوں کا کھڑے کھڑے علاج کر کے اُن کے رُوحوں کو سکون بخشا تھا، لیکن نہ جانے میرے ساتھ یہ اُلٹ معاملہ کیوں تھا کہ وہ جتنی بار بھی میرے سامنے آیا تھا، میری رُوح میں بیک وقت کئی کانٹے چبھو گیا تھا، لیکن کیوں؟ کیا نگاہوں کی طرح رُوحیں بھی آپس میں کچھ بھید بھاؤ رکھتی ہیں؟ ہاں……… بظاہر یہ رُوح کی ناپسندیدگی کا معاملہ ہی لگتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ظاہری شخصیت عام لوگوں کے لیے بے حد پُرکشش تھی۔ میں مما پپا کے ذریعے سلطان بابا کی خیریت تو کسی نہ کسی طور پر دریافت کروا ہی لیتا تھا، لیکن زہرا کی خبر ملنا محال ہوتا جا رہا تھا۔ مما نے ایک آدھ بار میرے کمرے ہی سے زہرا کے گھر بھی فون ملا کر دیکھا لیکن زیادہ تر اُس کے گھر کے نوکروں سے ہی بات ہو سکی۔ ایک بار زہرا کی اماں نے فون اُٹھایا بھی تو پتا چلا کہ زہرا گھر پر نہیں ہے۔ مما نے بددل ہو کر فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جو دن کسی نہ کسی طور گزار ہی لیتا تھا مگر شام ہوتے ہی جانے کہاں سے سارے جہاں کی بے چینیاں اس کے مٹھی بھر وجود کے چار خانوں میں در آتی تھیں۔ کاش ہمارا دل بھی ان ٹیلی فونوں کی طرح یادوں کے لیے خاص نمبر اور ڈائل کا محتاج ہوتا اور جب تک وہ خاص نمبر نہ گھمایا جاتا، تب تک یاد کی گھنٹی بھی نہ بجتی۔ یہ قدرت بھی ہمارے ساتھ کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے جن رابطوں کو آزاد چھوڑنا چاہیے تھا، انہیں ٹیلی فون جیسی ایجادوں میں قید کر دیا اور جن بے لگام جذبوں کو تالے میں بند کر کے رکھنا لازمی تھا، انہیں دل جیسی بے پروا سلطنت کے حوالے کر ڈالا۔ مگر تقدیر کو گلہ پھر بھی ہم کمزور انسانوں ہی سے رہتا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور میں گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند سے کوسوں دُور تھا۔ تنگ آ کر وہیل چیئر کے ذریعے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور باہر گرتی برف اور درختوں کی آپس میں ہوتی سرگوشیاں سننے لگا۔ برف کے پھول سوکھی ٹہنیوں سے گلہ کر رہے تھے کہ ابھی تو وہ انہیں خود سے لپٹائے بیٹھی ہیں، لیکن بہار آتے ہی جب نئے شگوفے کھلیں گے تو وہ ان سے ناطہ توڑ لیں گی اور ٹہنیاں بے وفا محبوب کی طرح ان سے کبھی پورے نہ ہونے والے عہد و پیماں کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر برف میں جمے ایک وجود پر پڑی جو یوگا کے کسی آسن کو اپنائے برستی برف میں کھڑا تھا۔ وہ گرو تھا۔ گرو کی آنکھیں کھلیں اور تیر کی طرح میری نظروں میں گڑ گئیں۔ جانے کیوں مجھے اُس کی آنکھوں میں شدید غصے کی جھلک نظر آئی۔ گرو نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی معمول کی طرح پلٹا۔ مجھے لگا میں خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں۔

……

پہلی قیامت

میں نے ہپناٹزم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس وقت محسوس کر سکتا تھا لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تب ہی میں جب برف کی چادر پر اپنی موٹرائزڈ وہیل چیئر کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاس کے برف سے اٹے میدان میں گرو کے قریب پہنچا تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کر سکتا تھا۔ گرو کچھ دیر تک فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ "دیکھا............ کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے............" لیکن اگلے لمحے ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اُس کی نظر کا سارا غرور چکنا چور کر دیا۔ "کیا تم ہپناٹزم بھی جانتے ہو............؟" گرو کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ "کیا مطلب............ یعنی کہ تم............ تم یہ سب کچھ محسوس کر سکتے ہو............؟" میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "ہاں میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو دھکیل تو لایا ہے لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔" آسمان سے برستی برف ہمارے وجود ڈھانپ رہی تھی۔ رات کے وقت جب آسمان سے برف گرتی ہے تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم طاقت والے بہت سے دُودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گرو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات کے سرکتے پہروں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گرو مزید بے چین ہو گیا۔ "میں پہلے ہی دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہاری رُوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر بیٹھ کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آ گیا ہے کہ تم خود مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر............؟" میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ "تم میرے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری رُوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دستکوں ہی پر کھلتے ہیں"۔ گرو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے تولتا رہا۔ "ٹھیک ہے، تو پھر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہو گا۔ تم مجھے اپنا راز دو گے اور بدلے میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤں گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی، بولو منظور ہے؟" اس حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نامکمل اور زخمی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ "اگر میری عاقبت کا سنورنا اور بگڑنا تقدیر نے تمہارے ذمہ ہی لگا چھوڑا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک سودا اور سہی............" اتنے میں ہم پر رات والی ڈیوٹی شفٹ کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری طرف دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وہیل چیئر سمیت دھکیلتی ہوئی اندر راہداری کی جانب لے گئی۔ گرو وہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ بعد میں مجھے اُس کی پکی عمر کی ہیڈ نرس کا نام اسٹاف ایمی معلوم ہوا۔ صبح جب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مما پاپا رات کو میرے کمرے سے ملحق کمرے میں ہوتے تھے، لہٰذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایمی کو منع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ

کرے۔ وہ ناراض ناراض سی، تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بخار ہو گیا۔ اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے''۔ مما پپا دُور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا۔ ''یہ فریضہ مما ہر دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں تھوڑی بہت تبدیلی ضروری ہے''۔ وہ بھی ہنس پڑی۔ ''باتیں خوب بنا لیتے ہو۔ تم رات کو اُس عجیب شخص کے ساتھ کون سی بحث کر رہے تھے؟'' ''کون..........؟ وہ گرو..........؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔'' ایمی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ''دیکھو، میری مانو تو اُس شخص سے دُور ہی رہو۔ پتا نہیں اسپتال والوں نے اسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اُس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔'' ایمی، گرو سے کافی بددل دکھائی دیتی تھی۔ ''میں نے سنا تھا کہ نرس ہر ذی رُوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے، لیکن آپ تو گرو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟'' ایمی نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''دیکھو لڑکے! میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک ''صیہونی'' ہے۔ دراصل..........'' ابھی ایمی نے بات شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور ایمی جلدی سے سامان کی ٹرے اُٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کئی بار صیہونیت اور صیہونی کی اصطلاح سنتا اور پڑھتا رہتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے۔ شام تک میں اسی ادھیڑبن میں رہا کہ ایمی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر جڑے بادلوں میں سے کسی ایک شریر جوڑے نے کچھ دیر کے لیے، اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر کسا اُودے بادلوں کا خیمہ ایک جانب سے کھل گیا۔ اور مٹھی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے نصف پیالے نے مسکرا کر زمین سے چھیڑخانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے بچھی برف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے بچپن میں ہمارے محلے میں گولے گنڈے والا سفید دُودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُنڈیلتا تھا۔ میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اُونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت پورا لندن سورج مکھی کے کسی پھول کی طرح دمک رہا ہوگا..........زرد لندن کی نارنجی بھیگی زمین اور جما ہوا دریائے ٹیمز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پھندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں کسا جاتا تھا، جیسے گیلی بان کی رسّی خشک ہونے پر سکڑتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار اُن کے قریب بستے ہیں، وہ گرم چمنیوں کے سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کے مگ لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کانچ سے پرے درختوں کو برف سے بوجھل شاخوں کو سجدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹیمز کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی گرو دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مما اور پپا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور ویمبلے تھیٹر میں، بہت عرصے سے لگاتار چلنے والا شیکسپیئر کا ڈراما میکبتھ (Mecbith) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پپا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پا رہے تھے۔ گرو نے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دُہرایا۔ لیکن آج میرے پاس بھی اُس کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے

لیے اتنا اہم کیوں ہے۔ ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر یہی ایک شفا تمہارے لیے معجزہ کیوں بن کر رہ گئی............؟‘‘ ’’اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو مگر سچ یہ ہے کہ تم جب کومے میں تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے روحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا اور تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اور میں نے گھنٹوں تمہارے سرہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری روح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعث مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب و غریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔‘‘ میں غور سے گرو کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اُس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اِس بار اُسے تفصیل سے پانی کے جہاز، کاسابلانکا، میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ذی الحج کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ گرو کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں۔ شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ’’تمہاری کہانی میں بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیونکہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ ’’خاص‘‘ ہو۔‘‘ میں مسکرایا۔ ’’میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر یہی دعا کوئی میرے لیے یروشلم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے چین نہ ہوتے۔..........‘‘ حالانکہ میں نے یہ بات کسی خاص نقطہ نظر یا طنزیہ لہجے میں نہیں کی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے اپنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا، لیکن گرو یوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ شدید غصے سے بولا۔ ’’تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رسوائی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو، لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ دکھانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔‘‘ میں نے حیرت سے گرو کی طرف دیکھا ’’لیکن یہ کیسے ہوگا؟‘‘ ’’کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل اپنے دماغ کو سُست چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا، جیسے تم مجھے اپنے اعصاب کے ذریعے مدعو کر رہے ہو۔ لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔‘‘ میں نے گرو کو ٹٹولا۔ ’’کیا تم پھر سے مجھ ہپناٹائز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی پیتھی کا سہارا لو گے.........‘‘ گرو کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ’’جنہیں اپنے چاہنے والوں کی دعاؤں اور خدا پر اتنا کامل یقین ہو.......... انہیں ان ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی جیسے معمولی شعبدوں سے نہیں ڈرنا چاہیے.........‘‘ گرو میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مما پپا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مما نے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کمبل دُرست کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظریں گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہندسے

تک پہنچ گئیں۔ میں نے گرو کی ہدایت کے مطابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گرو کی شبیہہ وقفے وقفے سے اُبھرتی رہی، اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گرو کی وہ چبھتی آنکھیں بُری طرح کھٹکنے لگیں۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گرو کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اُونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چھنکی چاندنی کی نیلگوں روشنی اس طرح اندر آ رہی تھی کہ لکڑی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چکور نیلی روشنی کے مستطیل ٹکڑوں سے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David Sta) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گرو سمیت تیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے چغوں سے ڈھکے ہوئے مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس میں کسی بھیڑ کا خون بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا تو وہ باقاعدہ دھات کی پتلی نالیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گرو نے دھیرے سے زیرِ لب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اُس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گرو نے عبرانی زبان میں زور زور سے قوم یہود پر مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرانا شروع کر دیئے۔ ”میکاباہ، عاموس، پرمیاہ، جون، یوحنا.........“ پھر سب سے پہلے گرو اور پھر اُس کی تقلید میں باقی سب چغہ پوشوں نے اپنے اپنے پیالے کا خون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں انڈیل دیا۔ خون تیزی سے چھ کونوں کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اُس میں چکنا فولاد اس طرح بھر گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بہنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہموار فولادی نالیوں میں اُنڈیلا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگرے باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوتے ہی داؤدی ستارہ مکمل ہو جائے۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رُک رُک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی اَن دیکھی رُکاوٹ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ سب ہی چغہ پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گرو کو اِس مزاحمت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اُس نے زیرِ لب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن کے چلتی وہ فلم بھی ایک دم یوں غائب ہو گئی، جیسے کسی سینما کی اسکرین پر ریل کا فیتہ ٹوٹ جانے سے سب کچھ پل بھر میں مٹ جاتا ہے یا کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گرو کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوتی برف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالمِ خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں یہی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چیختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اُٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مبہوت کر دینے والی......... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ”عاشق“ ہے تو برف ”معشوق“......... کہ دونوں کا مزاج خود اُن کی درجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مما پاپا سے پہلے ایمی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ”لندن کی خوب صورت برفیلی

صبح بخیر.........." میں مسکرایا۔ "ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ مسیحا گری کی ابتداء خوب صورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔" ایمی بھی ہنس دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مما پھر پپا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اُس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ "بہترین.......... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان.......... اِسے جاری رکھو۔" ایمی وہاں کچھ دیر مزید رُکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلتے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اُسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گرو اپنے مخصوص حلیے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مما کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے پپا کو نظروں میں انہیں دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پپا نے مسکرا کر پائپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی بہانے سے مما کو وہاں سے لے کر اُٹھ گئے۔ گرو نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ "کیا مجھے گزشتہ رات کی کہانی دُہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟" تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں تھا۔ گرو کا کوئی شعبدہ تھا۔ اس لمحے مجھے شدت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ کرتے تو آج میں گرو کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں شانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یاقوت سے لے کر جبروت تک جانے ایسی کتنی ان ہونیاں جھیل چکا تھا۔ اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگا کر گرو کو دیکھتا رہا۔ "نہیں.......... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے، لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم نے اچانک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟" اب چونکنے کی باری گرو کی تھی۔ "گویا تم سمجھ گئے تھے کہ میں نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں خلل پڑ رہا تھا" "لیکن میں تو وہاں نہیں تھا.......... اپنے کمرے میں.........." گرو مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ "اس کمرے میں صرف تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری عبادت میں رکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اِسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔" گرو نے مجھے بتایا کہ رات جو رسم میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں "مقدس بہاؤ" اور انگریزی میں "پور اوور" (Pour Over) کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے سربراہ بھیڑ کی مقدس قربانی کے بعد تبرک کے طور پر بھیڑ کا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر رکھتے تھے اور پھر ساتویں دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس رسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گرو قدامت پسند یہودیوں میں یہ رسم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی۔ اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل ساتویں دن کے خاتمے پر اُسی پور اوور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گرو سرگوشی میں مجھے یہ ساری تفصیلات بتا رہا تھا، تب ایمی نے دو بار وقفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں میں کسی ناراض بزرگ کی طرح ڈانٹا کہ میں اُس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ہوں؟ وہ مما سے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مما ہی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید "ادائے بزرگیت" سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں ایمی کو کیا بتاتا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ سب سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی بچے سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مما منع کیا کرتی تھیں، لیکن ایمی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع سہ پہر کی چائے کے بعد ہی مل سکا۔ جب مما اور پپا ٹہلنے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔

”لڑکے.......... میں نے تمہیں منع کیا تھا نا، اس گرو کے ساتھ بات کرنے سے؟“ مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”آخر آپ اُس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی پڑھا لکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے..........“ ایمی کو غصہ آ گیا۔ ”اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا سحر تم پر بھی نہ آزما بیٹھے..........“ گویا ایمی کو بھی گرو کے کمالات کی کچھ خبر تھی۔ اُس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گرو کا کافی اثر و رسوخ ہے اور اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا نروانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر شام اپنے درجنوں پیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گر بتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدائیوں میں ایمی کا اپنا بھائی پیٹر بھی شامل تھا، جو بقول ایمی گرو سے ملنے کے بعد باقاعدہ اُس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اپنا گھر بار چھوڑ کر اب سارا دن گرو کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ایمی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہداری کے اسپیکر پر کسی ایمرجنسی کے لیے ایمی کا نام پکارا جانے لگا۔ ایمی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھمی برف باری پھر سے ہلکے گالوں کی صورت آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گرو جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مدد گار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے جائے۔ میں نیچے پہنچا تو مجھے دُور سے گرو اپنے لمبے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جانب آتے نظر آیا۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ گرو نے میرے قریب پہنچ کر میری وہیل چیئر پر اپنی چھتری تان لی۔ ”اچھا ہوا تم آ گئے۔ میرا تم سے وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔“ میں نے اپنی پلک پر برف کے ایک موٹے گالے کی نمی محسوس کی۔ ”میں سننے کے لیے تیار ہوں..........“ گرو نے عجیب سے لہجے میں سرگوشی کی۔ ”تو پھر سنو.......... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو.......... اور جس ”قیامت“ کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے.......... مجھے خبر ہے کہ وہ ”قیامت“ کب آئے گی..........؟“

* * *

21 دسمبر 2012ء

میں گرو سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا لیکن اُس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا ''کیا مطلب.........'' ''مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیونکہ میرے حساب سے قیامت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔'' برف ہمارے چاروں طرف یخ بستہ قلعے کی فصیلیں کھڑی کر رہی تھی۔ سرد ہوا نے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ''تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟'' ''لاتعداد نشانیاں ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا ذکر ایک ذہین نجومی ''ناسٹراڈیمس'' صدیوں قبل کر چکا ہے۔ مثلاً چار فولادی پرندوں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (نائن الیون)، یہودیوں کو اپنی مادرِ ملت (اسرائیل) کا واپس ملنا، ساری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔ عظیم دجال کی آمد اور یہود کی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب صرف لدگشت کے مقام پر اُن کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اٹل ہے.........'' میں گم صم سا گرو کی یہ ساری بحث سنتا رہا۔ اب مجھے ایلی کے کہے ہوئے لفظ ''صیہونی'' کی اصل تشریح سمجھ آ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جبل پور میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اُس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور باقی تھا اور گرو جس فتح کو یہود کی آخری فتح بتا رہا تھا وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اُس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا جسے یہود ''آرما گیڈون'' (Armageddon) کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اسی علَم (جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرو کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اُس نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھٹکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً چٹخنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹتے ہی برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھر دی۔ میں نے غور سے گرو کی چبھتی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیا ہے وہ تاریخ؟'' گرو دریائے ٹیمز سے بھی پرے خلا میں برستی برف کے ستاروں کے پار کسی ان دیکھی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ''21 دسمبر 2012'' کیا۔ اتنی جلدی؟ یعنی صرف تین سال بعد، ''ہاں میرا علم یہی کہتا ہے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت کی تیاری کر لو، وقت بہت کم ہے۔'' گرو واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اُونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے نشان بناتا برف کی دُھند میں کہیں غائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دُھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے کہرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اُس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزر گئی کہ یہ نئی جنگ اُن کے بنا میں کیسے لڑ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دُھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اسی دُھند میں سے

ڈودھیا سفید لباس پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے لبوں پر وہی اپنی ازلی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے۔ ''کیوں میاں! پھر اُلجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں............؟'' مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ''آپ کہاں رہ گئے تھے مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں ایک قدم بھی آپ کے بنا اُٹھنا دوبھر ہو جاتا ہے میرا............؟'' وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ''موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہو گی۔ ساحر میاں............'' میں شدید پریشان ہو کر بولا ''آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کہیں جا رہے ہیں............؟'' ''سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اس راستے کے مسافر ہیں، لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبار زندگی رُک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دُور ہو جائیں تو رُوحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین ثابت کرنا ہو گا۔ جیتے رہو'' سلطان بابا نہ جانے اچانک ہی اُس دُھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کا کمزور پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریائے ٹیمز یا ویسٹ منسٹر پل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آ رہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں وہیل چیئر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہے۔ چاہے بیساکھی کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دو روز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور اُن کی تشخیص کے مطابق مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید کئی ہفتے درکار تھے۔ بقول ایمی، جب اُس نے البرٹ کو صبح کے معائنے سے قبل اُن کے دفتر میں یہ خبر سنائی تو اُن کے ہاتھ میں پکڑا اسٹیتھ گر گیا اور وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ ''کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نوجوان............؟'' ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ ''ناقابل یقین............ اگر یہ صرف قوتِ ارادی کا کمال ہے تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔'' مما پپا بھی بے حد خوش تھے۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا، لہٰذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے سامنے پاپا کو اپنے شہر کے ہسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا دم مزید اٹک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہونے لگی تو انہیں مصنوعی سانس کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اُڑ کر واپس اپنے شہر پہنچ جاؤں۔ مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ ہی اصل زندگی کی ابتداء ہے۔ لیکن ہم انسانوں کو ازل سے ابد تک اِسی فانی جسم کی محبت ہی میں مبتلا رکھا گیا ہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی اپنے کا............ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھو دینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان زندگی بھر جی کر جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک ''اجنبی موت'' کو گلے لگانے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں تو مجھے اپنی بے بسی پر شدید غصہ آیا

اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اِسی خیال میں بیساکھیاں ٹیکتا شیشے کی چھت اور شفاف دیواروں والی اس راہداری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دُور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں کے ایک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بینچ نما تختے درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔ یہاں ہسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا اچھے دنوں کی دھوپ کا مزا لے سکتے تھے لیکن اس وقت شیشے کی چھت اور کانچ کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر دُودھیا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرو پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ’’میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے۔ اُسے ایک ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟‘‘ گرو کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ نہ جانے اُس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی۔ لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا، لہٰذا بہتر یہی سمجھا تھا کہ اُس کو کوئی جواب دیے بنا ہی آگے بڑھ جاؤں، لیکن دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے گرو کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ ’’کیوں خود پر سے بھروسا اُٹھ گیا ہے یا پھر اپنے رُوحانی اُستاد کی ناکامی کا ڈر ہے..........؟‘‘ مجھے یوں لگا جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کواڑ توڑتے ہوئے ساحر باہر نکل کر گرو کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیما رکھنے کی کوشش کی۔ ’’تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعبدہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک معجزہ ہے۔ تم جس ہنر کو پانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو میرے نزدیک وہ دعا کی صورت پل بھر میں قبول ہو سکتا ہے۔ بات صرف یقین کی ہے۔ اٹل یقین.......... لیکن افسوس تم نے سب کچھ سیکھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا.......... اور شاید اِسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو..........‘‘ گرو میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا ’’نہیں.......... میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پا لیا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیسا خوف؟ ڈرنے کی ضرورت تو تم جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے کی عادت ہے۔‘‘ میں نے غور سے گرو کی طرف دیکھا۔ ’’مجھے صاف صاف کہو تم چاہتے کیا ہو..........؟‘‘ گرو کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ’’میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے نقاب اُتار دو۔ پہلے پہلے تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا موٹا شعبدے باز ہی سمجھا تھا لیکن اس رات عبادت کے دوران جب تم نے ہم سب کا ارتقا توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا، تم اگر واقعی، اس ابدی راہ کے مسافر ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں‘‘۔ گرو کی باتیں حسبِ معمول اُس کی شخصیت کی طرح اُلجھی ہوئی تھیں لیکن آج میں نے اسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ’’اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی اُمید ہی میں کرو گے‘‘۔ گرو مجھے راستے پر آتا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ’’تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا، لیکن بے فکر رہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی دنیا کے اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیونکہ تمہارے پاس دوسروں سے کچھ سوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ تو میں تم سے ’’ابدی سکون‘‘ کا وعدہ کرتا ہوں۔ وہی ابدی سکون جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی

رُوح ازل سے بھٹک رہا ہے اور ابد تک سرگرداں ہی رہے گا۔ بولو منظور ہے میری پیشکش..........؟" گرو اُمید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرو چاہتا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُس کے نظریے کا پرچار کروں۔ میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبدے سے محمول کر رہا تھا۔ ایمی مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرو اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کرواتا تھا، جہاں اُس کی شخصیت اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر وہ صرف اُسے سنتا اور سراہتا بلکہ اس کے گروہ کے رُکن باقاعدگی سے گرو کی رُوحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اسی لیے گرو کے فدائین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گرو کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک میرے لیے ایک معما ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اُسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت برپا ہونے والی ہے اور بظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے آس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو آنے والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویے سے بہت آسان اور سادہ دکھائی دینے والی گرو کی یہ مہم بے حد پیچیدہ اور پُر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب کے لوگوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن کے ہائیڈ پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے کی مہم چلا رہا ہے تو کسی کو چاند پر بکنے والے پلاٹوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیشوا تھا تو کوئی ساری دنیا سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گرو اگر کھلے عام اپنے نظریے کا پرچار کر رہا تھا تو یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گروہ بھی دیکھے تھے جو حکومت سے "اعلانیہ اجتماعی خودکشی" کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس لحاظ سے لندن کے معاشرے میں گرو کی "تعلیمات" کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ایک نوجوان طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرو کو باقاعدہ "رُوحانی دیوتا" کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایمی کا چھوٹا بھائی پیٹر بھی شامل تھا۔

باہر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دُور سے مجھے اور گرو کو اس شیشے کی شفاف ٹیوب میں کھڑا دیکھتا تو اُسے یہ جگمگاتی بقعۂ نور بنی راہداری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے ڈھکے دُودھیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی لشکارہ تیر رہا ہو۔ راہداری کی اندرونی حدت کی وجہ سے شیشے کی دیواروں اور بیضوی چھت پر برف جم نہیں پا رہی تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہہ رہی تھی، جیسے ہم کسی شیشے کے خول میں بند گہرے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اتنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی۔ وہ گرو کو کسی مریض کی درخواست پر "ریکی" کے لیے خصوصی کمرہ نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیونکہ یہ گرو کے ہسپتال کے دورے کے مخصوص اوقات تھے۔ سو، اُس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ "مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اس "سچ کے سفر" میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے"۔ وہ اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گرو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں اُلجھا رہا۔ جانے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دیس میں اپنے والدین کو مزید کسی نئی اُلجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان تھے لیکن میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاتبِ تقدیر نے میری قسمت کی

سیاہی کچھ زیادہ گاڑھی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرا کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ گھونٹنے کے لیے اپنے بل کسنے لگا۔ ہمارے تھکے ہوئے بے دم پھیپھڑے اپنا پورا زور لگا کر تازہ ہوا کی ایک لہر کو اپنے اندر اُتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑپھڑاتے ہیں لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس لینے کے تمام راستے پہلے مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہے، اُتنی ہی زیادہ اُسے اذیت ہوتی ہے۔ جان رُک رُک کر نکلتی ہے۔ ایسے میں فنا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ سانس لینے کی اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی نچوڑنے کی اجازت دے دی جائے۔ سو میں نے بھی زہرا کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا۔ شاید میرا مقدر یہی یادوں کی امر بیل تھی، کیونکہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے کہاں جا چھپی تھی۔ وسوسے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی وسوسوں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی۔ کون کہتا ہے کہ محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے تارِ عنکبوت ہی پایا تھا۔ بدنامیاں، رُسوائیاں، ناکامیاں، درد، تڑپ، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر ہے اور لندن کی اس کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو رونے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا انتظار کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات جھلینا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایمی میری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی تو اُس کے چہرے پر معمول کی روشنی پہلے سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا دھیما پن بھی اُن کی پوری شخصیت کو بجھا کر رکھ دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایمی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی بتا پائی کہ اُس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیونکہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے چوری چھپے کسی ''مقدس عبادت'' کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک لمحے ہی میں گرو کا عبادت خانہ اور ''پوراوور'' کی رسم کا منظر کوندے کی طرح لپک کر رہ گیا، لیکن میں نے ایمی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میری کوئی بہن نہیں ہے۔ سنا ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا آپ وہ جگہ پُر کر کے میری مما کا ہاتھ بٹانے کی زحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب مما......... مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتیں۔ جلد ہی تھک جاتی ہیں''۔ میرا وار کارگر رہا اور ایمی کا چہرہ پھر سے جگمگا سا گیا۔ ''بے فکر رہو میں اس صفت میں خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک وہی اس انعام کا اکیلا حق دار تھا۔ آج سے عبداللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔'' ایمی جتنی اداس آئی تھی اُتنی ہی خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اُس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرصت میں کسی بھی طرح میری پیٹر سے ایک ملاقات ضرور کرائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی میں جتنے بھی واقعات رُونما ہو چکے تھے، اُن سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایمی سے ملاقات کے بعد مجھے گرو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گرو مما کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کر چکا تھا، لہٰذا اب اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں ہی مجھ سے ملاقات کرے۔ لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اُسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرے

سے نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہمدردی بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار لگتا تھا، لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لاچارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف مخلوق کو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روز کے لیے بیساکھیوں کے سہارے چلنا لازمی قرار دے دیتا، تا کہ یہ کمزور حافظے والی مخلوق جب کبھی اکڑ کر اس زمین پر چلنے کی کوشش کرتی تو اُسے اُس کی حیثیت یاد دلائی جا سکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر کرنیں چھم سے گرتیں تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگدا سی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں چندھیا سی جاتی تھیں۔ ہسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدر میری کا مجسمہ تراشا ہوا تھا، پاس ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین پکی اینٹوں والی روش سے برف ہٹا رہی تھی۔ تب ہی مجھے ایمی ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ سارے راستے ایمی سے کسی بات سے اُلجھتا ہوا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ایمی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر تعارفی کلمات کہے۔ ‘‘پیٹر .... یہ ہے عبداللہ .... تمہارا بڑا بھائی۔’’ پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ‘‘ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔’’ میں مسکرایا۔ ‘‘تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو۔ پیٹر عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟’’ پیٹر ہنس دیا۔ ‘‘میں نے سنا تھا کہ مشرق بڑا سخی ہے، آج دیکھ بھی لیا’’ میں نے بات جوڑی ‘‘ہاں .... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے سے ہی پوری ہو جاتی ہو تو مجھ جیسے بخیل بھی سخی ہو جاتے ہیں۔’’ اس بار پیٹر اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔ ایمی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جائے کے ہونٹوں پر یہ جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ ‘‘دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی ہے۔ اس کا علاج کیا جائے۔’’ میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کے یہ انمول تکرار سنتا رہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اُس نے ایمی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیونکہ اُسے کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایمی کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گرو سے متعلق تھی۔ ایمی کو رخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گرو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ‘‘پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟’’ ‘‘میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب میں مدعو کر سکتے ہو؟’’ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

……

صیہونی

شاید گرو مجھ سے ایسی توقع نہیں کرسکتا تھا کہ میں خود، اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا، لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا تھا۔ لہٰذا اگلے لمحے وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ ''ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آج نہیں، تو کل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی۔ لیکن تم اسپتال سے چھٹی کیسے لو گے.......... اور پھر تمہارے والدین.......... وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تنہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔'' ''والدین کی تم پروانہ کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔ البتہ اسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے رُوحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دُور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔'' گرو مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔''

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر پاپا اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح مما سے مجھے گرو کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں گرو کی گاڑی میں اسپتال سے باہر نکلا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ماں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اُس طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سنٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بنجارے لوہے کے بڑے ڈرمز میں آگ سلگا کر اس کے گرد کھڑے ہاتھ اور جسم تاپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگڑائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چہروں، خوشبوؤں، کلوزز اور ملبوسات کے ہجوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپرا تھیٹرز اور کلبوں کی جانب رواں دواں تھے۔ جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدہوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھوجنا تھا۔ اس رنگ و خوشبو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اسی دنیا میں کال گڑھ اور تحصیل ماہی جیسے اندھیرے قطعے بھی موجود ہیں جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر بجھ جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اُجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دیا جائے گا یا نہیں.......... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی جزا ملے گی؟ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ گرو کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرو خود مجھے لینے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہوگئی تھی۔ گاڑی رُکتے ہی ایک خادم کی معیت میں مجھے ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی

پہلے سے کھچاکھچ بھرے ہوئے تھے۔ پتا چلا کہ آج گرو کا لیکچر ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا رُوحانی علاج بھی کرے گا۔ مجھے تیسری رو میں بیٹھے ہوئے پیٹر کی ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرو اپنے مخصوص چغے میں اسٹیج پر نمودار ہوا تو ہال میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اُس نے یونہی آنکھیں موندے پورے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی سے دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکانکی انداز میں بند ہو گئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند آنکھوں کے پردے کے پیچھے گرو کی شبیہ مسکرائی ”خوش آمدید“۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرو اُسی طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار میرا مقابل ٹیلی پیتھی کے ہتھیار سے لیس تھا اور میں بالکل تہی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد اُن لوگوں کی تھی جو گرو کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اُس کے اس ہفتہ وار رُوحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرو کے چاق چوبند شاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرو کے گرد نور کا ایک ہالہ روشنی کے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرو کو لوگوں کو مسخر کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں کا مکمل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے باسیوں سے خالی نہیں، جنہیں رُوح کی پیاس ایسی جگہوں پر کھینچ لاتی ہے، جہاں رُوحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید انسان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اُس کی رُوحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں گرو جیسے لوگوں کی کامیابی اور تعظیم سو فی صد یقینی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ لوگ سب کچھ پا لینے کے باوجود بھی کسی رُوحانی مسیحا کی تلاش میں دربدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرو نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ”قسم ہے مجھے اُس خدائے عظیم و برتر کی جس نے ہمارے اکابر پر کبھی من و سلویٰ برسائی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تر بنایا۔ جس نے ہمارے لیے بارہ چشمے تفویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر پھاڑ کر راستہ بنایا۔ اُسی رب کی قسم یہ دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل کر اُس اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم خود کو اُس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیگر بے چین لوگوں تک پہنچائیں، جنہیں سچ کی تلاش ہے مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پائے“۔ گرو کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگوں کو اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اُس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات کے ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک ملگجا اندھیرا اور مکمل سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر اُن بڑے بڑے روشن دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان پر جھلک رہا تھا اور پھر چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ”مقدس بہاؤ“ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے نظر دوڑائی لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشستیں بچھی ہوئی تھیں اور

ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرو کی بات سُن رہے تھے۔ درس کے بعد رُوحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت ترتیب وار نام پکار کر مریضوں کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بدحال اور نڈھال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔ ان میں سے کئی وہیل چیئر اور بعض دوسروں کے سہارے گرو کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ گرو اُن سے نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کی دو اُنگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک مار دیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سُدھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے آس پاس دو خادم پہلے تیار کھڑے تھے، اور پھر چند لمحوں پر بعد جب اُسے ہوش آتا تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس اپنی نشست پر آ بیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان سا اُمڈ آتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرو سے مسیحائی کا درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرو نے ہاتھ اُٹھایا اور پورا ہال یک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی رُوح موجود ہی نہیں تھا۔ گرو کا اشارہ میری طرف تھا ”عبداللہ..........میرے دوست..........تم بھی یہاں نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں“۔ سب ہی کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرے پاس انکار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ گرو کا یہ حملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ ہوش تب آیا جب میں اپنی بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے گرو کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا ”اپنے دل سے ہر شک و شبے کو نکال دو میرے دوست۔ یاد رہے کہ دائمی علاج صرف میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف رُوح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف اُن پر ہوتا ہے جو آئندہ کے لیے اپنی رُوح کو کسی گناہ سے پراگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے ہوں، لیکن اگر اُن کے دل میں کوئی چور ہو تو میری یہ دُعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا تم بھی عہد کرو کہ ہمیشہ اپنی رُوح کو پاک رکھو گے۔“ گرو کی آواز برقی مائک کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی اور سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں بغاوت کی لہر کو اُن سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گرو سے سامنا ہوا تھا میں نے اپنے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اُس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کہا یا کیا تھا، جسے دیکھ کر یا سن کر عام انسان خود کو صرف سحر زدہ ہی محسوس کر پاتا۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت ضرور تھی، جو مجھے گرو سے دُور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اُس کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود بھی مجھے بار بار خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اُس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اُس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی شہادت کی اُنگلی سمیت دو انگلیاں میرے ماتھے میں جیسے باقاعدہ پیوست ہو چکی تھیں۔ گرو کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اور ایک پل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہوا۔ آبِ حیات نے میری نس نس میں ٹھنڈک تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ میں نے اس مدہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور سے زمین پر جمانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کسی مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے بیساکھیاں چھوٹ گئیں۔ گرنے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھام لیا گیا اور اس کے بعد نشست تک پہنچائے جانے

کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں مدہوش ہی رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سن کرنے والے بہت سے ٹیکے بیک وقت پیوست کر دیئے گئے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد کہیں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ مما نے جب چوتھی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی دہائی دی، تب میں نکلا۔ اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں گلدستہ لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مما ہم دونوں کو کافی کے مگ تھما کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر اُن کے جاتے ہی جلدی سے بولا ''بڑے بھائی، تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی گرو کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے مُسکرا کر پیٹر کو دیکھا ''ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔'' پیٹر کو زور کا جھٹکا لگا۔ ''گویا تم بھی............؟ ایمی بھی ایسی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرو کی رُوحانی طاقتوں پر یقین کیوں نہیں آتا''۔ میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا۔ ''یقین ایک ایسا سودا ہے، جسے دلیل کی تلوار سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں............ تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہو اور مجھے میری بے یقینی کے ساتھ جینے دو............ جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔'' پیٹر میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''مجھے تمہاری یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے، عبداللہ۔ تم ایمی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جلد ہی گرو کو اپنا اُستاد مان لو گے۔ وہ زبردست انسان ہے۔'' ''میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عظمت تسلیم کر لوں گا، لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر زندگی میں تمہیں کسی لمحے بھی ایسا محسوس ہوا کہ تم نے جو راہ چنی ہے، وہ منزل کی طرف نہیں جاتی، تو تم ایمی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنی تعلیم مکمل کرو گے اور ایمی کے خواب پورے کرو گے۔'' پیٹر نے خوش دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو وعدہ رہا............ پکا وعدہ''۔ ٹھیک اُس لمحے ایمی دواؤں کی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور پیٹر کو دیکھ کر بولی ''چلو بچے، ڈاکٹر البرٹ کے راؤنڈ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہاں لے تو آئی ہوں، لیکن اسپتال کے نظم کا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے۔'' پیٹر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ ایمی نے بھیگی پلکوں کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ ''آج سالوں بعد پیٹر نے خود کسی سے ملنے کی فرمائش کی۔ جانے کیوں۔ پر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ میرا پیٹر بہت جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔'' میرا دل اندر سے لرز سا گیا اور بس ایک ہی صدا نکلی کہ یا اللہ اس معصوم بہن کے یقین کی لاج رکھنا۔ میں نے گزشتہ روز ایمی سے یہودیوں کے بارے میں لکھی گئی چند اہم کتابیں لانے کو کہا تھا۔ ایمی نے دو کتابیں میرے حوالے کیں۔ ''تمہاری فہرست میں موجود کچھ کتابیں لندن کے کسی بھی بک اسٹور سے نہیں مل پائیں، لیکن میں نے ہالینڈ میں اپنی ایک دوست کو ای میل کی ہے، وہ جلد ہی وہاں سے کتابیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جانتی ہوں، تم ان کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو۔ چاہو تو میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ میں یہود کے بارے میں یہودیوں سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔'' میں نے چونک کر ایمی کو دیکھا۔ ''وہ کیسے............؟'' ایمی نے گہرا سانس لیا ''کیونکہ میری سگی ماں ایک یہودن تھی۔'' میرے ہاتھ سے کتابیں گرتے گرتے بچیں''۔ ہاں، بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میری ماں قوم یہود سے تھی۔ میرا باپ سادہ لوح عیسائی تھا، لیکن میری ماں کی زندگی برباد کرنے والا بھی ایک صیہونی ہی تھا۔ تم اُس دن صیہونیت کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا۔ تو سنو، یہ سچ ہے کہ ہر صیہونی یہودی ہوتا ہے

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر یہودی صیہونی نہیں ہوتا۔ بس، یوں سمجھ لو کہ قوم یہود کا وہ شدت پسند طبقہ، جو اپنے نظریئے اور مقصد کے حصول کے لیے ہر ناجائز کو جائز سمجھتا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کا امن برباد کرنے پر تل جاتا ہے، اُسے صیہونی کہا جاتا ہے"۔ ایمی بولتی رہی اور میں دم سادھے بیٹھا سنتا رہا۔ ایمی نے مجھے بتایا کہ اُن کی زندگی بہت پُرسکون تھی۔ جب وہ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی پیٹر کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتی تھی۔ ایمی تب اپنے اسکول کی نویں جماعت کی ذہین طالبہ تھی۔ اُس کا باپ مضافات میں موجود ایک فیکٹری میں فارمین کا کام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تاوقتیکہ اُن کے قصبے میں جم نامی وہ یہودی اسکول ٹیچر آیا، جس کی پُراسرار تعلیمات نے ایمی کی ماں کی زندگی میں طوفان برپا کر دیا۔ وہ گھر بار چھوڑ کر صرف یہودی کلیسا کی ہو کر رہ گئی اور آخر کار اپنے شوہر سے طلاق لے کر اَن جانے سفر پر ایسی روانہ ہوئی کہ پھر ایک روز اُس کی موت کی خبر ہی واپس آئی۔ ایمی کا باپ اس صدمے سے کبھی سنبھل نہ پایا اور دو سال کے اندر اندر وہ بھی اپنی شریک حیات کے پیچھے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایمی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نرسنگ کا شعبہ اختیار کرنا پڑا، لیکن سب کچھ ختم ہونے کے باوجود اُس کے دل سے صیہونیت اور اُس صیہونی جم کے خلاف نفرت کبھی ختم نہ ہو پائی۔ وہ آخری لمحے تک اِسی کھوج میں رہی کہ آخر اُس ٹیچر کی تعلیمات میں ایسا کیا سحر تھا کہ اُس کی ماں کی ممتا اور وفا بھی اُسے نہ روک پائی۔ ایمی کی یہی کھوج اُسے اس حادثے والی جگہ پر لے گئی، جہاں اُس کی ماں ایک کار ایکسیڈنٹ میں ماری گئی تھی، تب ہی ایمی کے ہاتھ بیت المقدس کی عمارت کے وہ نقشے لگ گئے، جو ایمی کی ماں نے اپنے پرانے کپڑوں کے صندوق میں چھپا کر رکھے تھے۔ اُس وقت ایمی پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کی ماں صیہونیوں کے کسی ایسے گروہ کی آلۂ کار بن چکی تھی، جو مقدس ہیکل سلیمانی کی تلاش میں بیت المقدس کے گرد کھدائی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایمی نے پیٹر سے چھپا کر وہ نقشے تو گھر آتے ہی جلا دیئے، لیکن اپنے دل میں جلتی آگ کا الاؤ کبھی بجھا نہیں پائی۔ وہ آج تک صیہونیت ہی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی، اِسی لیے پیٹر کو اپنی نظروں کے سامنے پھر سے اُسی جال کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے باوجود ضبط کے رو پڑی، "تم نہیں جانتے عبداللہ۔ کم سنی میں ماں باپ کی جدائی کا دُکھ کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے بھی تقدیر سمجھ کر صبر کر لیتی لیکن وہ کون سی بہن ہو گی، جو اپنے سگے بھائی کو یوں پل پل مرتے دیکھ سکے۔ پیٹر کا جسم پچھلے تین ماہ میں گُھل سا گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سرخ خلیے ختم ہو رہے ہیں اور جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس لیے ہر پندرہ دن بعد اُسے تازہ خون کی بوتلیں لگائی جاتی ہیں۔ رہی سہی کسر اُس گرو نے پوری کر دی ہے۔ پیٹر آج بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ گرو کے رُوحانی علاج کی طاقت سے ٹھیک ہو جائے گا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گرو سے کئی سیشن کروانے کے باوجود اُس کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے۔" ایمی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور میں اُس سے تسلی کے دو لفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول پا رہا تھا۔

اس رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا کہ میں بیت المقدس کے باہر کھڑا ہوں، جہاں یہودیوں نے ایک لمبی سی خندق کھود رکھی ہے اور وہ زمانہ قدیم کے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ لوگ قبلۂ اول میں داخل ہو کر عبادت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہودی ہجوم انہیں درخت کی لمبی لمبی شاخوں سے مار کر دھکیل رہا ہے۔ ایسے میں میری نظر سلطان بابا پر پڑتی ہے، جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور نہ جانے میں کس طرح خندق کے آخری کونے تک پہنچ جاتا ہوں۔ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ہجوم بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے اور مسلمان عبادت کے لیے بیت المقدس کے صحن تک پہنچ جاتے ہیں، پھر اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کوئی آنکھ مسلسل میری نگرانی کر رہی ہو۔ کھڑکی سے

باہر دریائے ٹیمز کا جما ہوا یخ پانی آسمان سے گرتی برف کی ہلکی پھوار کے ساتھ ہولے ہولے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے ایکی کی لائی کتابوں کے صفحے پلٹنے شروع کر دیئے اور صبح کا اُجالا پھیلنے تک مجھے قوم یہود کے بارے میں جو کچھ پتا چلا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کبھی یہ قوم واقعی خدا کی محبوب ترین قوموں میں سے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہر اعزاز سے محروم ہوتی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس قوم کی ناشکری اور بدعہدیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور زکریا علیہ السلام، یوحنا (جون) اور میکھا یاہ کا خون ناحق اسی قوم کے سر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانیاں اور ناشکرے پن سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کروانے کی سازش تک ہر موقعے پر خود اس قوم نے خدا کے غضب کو دعوت دی اور آخر کار ان سے نبوت اور وطن چھین کر قدرت نے ان کی سزا پر مہر لگا دی۔ یہ قوم دربدر ہوئی، زمانے بھر کی لعنت اور پھٹکار اس کا مقدر بنی، لیکن اس نے پھر بھی اپنے اعمال نہ بدلے اور سود خوری کی شکل میں خدا سے جنگ رکھی، جو آج تک جاری ہے۔ رفتہ رفتہ سود کے ذریعے انہوں نے دنیا کی معاشیات کو اپنے قبضے میں لے کر مختلف سلطنتوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا، جب دنیا کی عظیم طاقتیں (سُپر پاورز) ان کے پنجہ سود تلے دبی ان کی اُنگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہی یہودیوں میں سے ایک انتہا پسند طبقہ اُبھرتا گیا، جو بعد میں صیہونی کہلائے اور جن کے اندر نبوت چھننے اور بے وطن ہونے کا غصہ انتقام میں بدلتا گیا اور انہوں نے قبلہ اوّل کو ڈھانے کی ناپاک سازشیں شروع کر دیں اور نبوت کی جگہ دجال کو اپنا آخری مسیحا مان کر اُس کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں، جو بقول اُن کے، اُن کی آخری فتح کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں سے ان کی بنیادی نفرت کی ایک وجہ ہمیشہ یہ بھی رہی کہ مسلم عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصلی مسیحا ثابت ہوں گے، جو دجال کو قتل کر کے اس دنیا میں امن قائم کریں گے۔ مذہبی عقیدے سے قطع نظر یہ قوم بے حد منظم، متحد اور ذہین تھی اور ہے۔ اصل یہود اسلام کی سچائی اور عظمت سے واقف ہونے کے باوجود فطرتاً سازشی ہونے کی وجہ سے اسے کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پائے، اور کہیں نہ کہیں وہ اب بھی اسلام ہی کو اپنی بربادی کی اصل وجہ گردانتے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے کسی موقعے سے نہیں چوکتے۔ جبکہ انہی یہودیوں میں آج بھی ایک ایسا معتدل طبقہ موجود ہے، جو صیہونیت کو یہودیت کے لیے ایک گالی سے کم نہیں سمجھتا، لیکن ایسے یہود کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کہیں کم ہے۔

میں نے کتاب کا آخری صفحہ پلٹا تو نسبتاً صاف آسمان سے سورج اپنی پہلی جھلک دکھلا چکا تھا۔ میرا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے گرم پانی کا شاور لینے کے ارادے سے اُٹھنا چاہا، تب ہی میرے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ مجھے گرو کا تمتماتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گرو ہی نے سانپ جیسی پھنکارتی آواز میں اس خاموشی کو توڑا۔

”کیا تم کبھی بیت المقدس گئے ہو............؟“

⁂……⁂

آخری مسیحا

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرو کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات میں سر ہلا دیا۔ ’’ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا۔‘‘ گرو نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ ’’تم.......... آخر کون ہو تم؟‘‘ میں پلٹا۔ ’’یقین جانو میں خود اسی سوال کی کھوج میں یہاں تک پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا ہے۔ تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو، میرے نزدیک وہ سراب ہے۔ تمہارا آخری مسیحا کوئی اور.......... اور میرا نجات دہندہ کوئی اور ہے۔‘‘ گرو نے اطمینان سے میری بات سنی۔ پھر تاسف سے بولا ’’تو آخر تم بھی اُس مذہبی تعصب کا شکار ہی ہو گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے۔ جانے کیوں میں تمہیں دوسروں سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔‘‘ اچانک گرو کی نظر میری بستر کے ساتھ جڑی ہوئی چھوٹی سے میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایمی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرو کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ’’جانتے ہو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی وساطت سے جانا ہے، جبکہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو، جس دن مجھے جاننے کے لیے اپنے خدا کی رسی ہلاؤ گے۔ سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔‘‘ گرو اپنی بات ختم کر کے پلٹا اور پھر رُک گیا۔ ’’اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ پر آئے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اُس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔‘‘ گرو پلٹ کر چلا گیا لیکن میرے لیے اَن گنت سوالوں کا بھنڈارا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ، لیکن یہ سچ مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا۔ کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا..........؟ میں شام تک سر پٹختا رہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن میں نہ بیٹھ سکا۔ گرو ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں تو پھر اس نے اپنے خدا کی وساطت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جبکہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام ہوتے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں مما پپا سے ضد کر کے تنہا اپنی بیساکھیاں ٹیکتا باہر برف سے اٹے میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکھے ہار جھول رہے تھے۔ شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے بچھڑے ہوئے پتوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوبی بینچ کو جھاڑ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی سانس کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اُٹھ رہا تھا اُس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید وہ عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دُور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک سرسراہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بخود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا

کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ موذن کی آواز میں عجیب سا سوز تھا، جو میں اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ''اشھدان محمد رسول اللہ .... اشھدان محمد رسول اللہ ....'' اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھما کا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں یہی تو تھا وہ کھلا راز، حیرت ہے۔ اتنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی ﷺ کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی الزماں ﷺ کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہود کی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ بھی تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھن گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہود کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو بھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی ﷺ کا اُمتی ہوں جس کے لیے اس ساری دنیا کا بکھیڑا اکھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں۔ ایک عالم ہماری عظمت و بڑائی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بھیڑیوں کی طرح ہماری بوٹیوں کو نوچنے کے لیے ہمارے در پے ہے اور ہم خود کو تھالی میں سجا کر انہیں پیش کر رہے ہیں۔ گرو ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، میرا اور اُس کا بھلا کیا مقابلہ۔ اُس نے ہم سے سچی دشمنی نبھائی۔ وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور میں جو مذہب کی محبت کا دعویٰ دار تھا، میں نے کیا سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں .... کیا بس اتنا ہی تھا میرا دین .... ؟ صرف ایک سال پہلے تک میں خود اسی لندن کے کلبز اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد بھی میں کیا تھا۔ دردر بھٹکتا ہوا ایک بھکاری .... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے ضمیر کو پاک نہ کر سکے۔ کیا میں اُس نبی آخر الزمان ﷺ کے اُمتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ایک وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا کی محبت پانے کے لیے اُس کے نبی ﷺ کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس اُمتی پر وار دینے کا وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کلیے ہی کو شرط بنا لے۔ مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے، جو صرف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی جاتی اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسو زمین پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش انسان کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے ڈھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایمی میری تلاش میں اس طرف آنکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیٹ کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس معطل کرنے کے لیے تیار تھی۔ ایمی دراصل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کر رہی

ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے بے حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے دورے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیٹر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ”مقدس سفر“ پر جائے گا، جب کہ پیٹر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی۔ ایمی کو ڈر تھا کہ وہ ایک بار گرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اسی طرح ایک روز اُس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلی تھی اور پھر کبھی نہیں لوٹی۔ ایمی کو سو فی صد یقین تھا کہ گرو بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نوجوانوں کو کسی اسرائیلی مشنری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلافِ توقع گرو نے دو دن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری میں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد نڈھال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے لیکن اُسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سمیٹے رکھنا پڑے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ”کیا تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کمرے میں مغرب سے پہلے کا اُداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مما پپا شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسبِ معمول گرو کی آنکھوں میں وہی جیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں نے پہلی مرتبہ گرو سے درخواست کی ”کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیٹر بہت بیمار ہے، اُسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ“۔ گرو زور سے ہنسا ”تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ جچتی نہیں۔ جنہیں قدرت کے عزیز ہونے کا غرور ہو وہ گزارشات نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔“ میں گرو کا یہ طنز بھی جھیل گیا۔ ”شاید میں کبھی خود کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں۔ تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جان نثار مل جائیں گے۔ اس معصوم لڑکے کو بخشش دو۔ وہ اپنی کمزور بہن کا آخری سہارا ہے۔“ گرو کو جیسے میری بے بسی دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیٹر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے..........؟“ میرے اندر بیک وقت جیسے بہت سی پُرشور ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب ہلے ”ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔ پیٹر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اُسی وقت اُس کے عقب سے ایمی کی تیز آواز اُبھری ”نہیں، عبداللہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیٹر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں ہی سہی۔“ گرو ایمی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بدمزا دکھائی دے رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی“۔ وہ غصے سے مڑا اور واپسی کے لیے قدم اُٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔ ”رکو.......... اگر بات اختیار کی ہی ہے تو واقعی تمہیں اس وقت اختیار حاصل ہے اور اس اختیار کا گھمنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے، تو پھر ایک بیمار اور کمزور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل..........؟ اگر تمہیں پیٹر کو ساتھ لے جانا ہی ہے تو اُسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے پر کیوں نہیں آزماتے۔ یا تمہاری ٹیلی پیتھی صرف لبھاتی اور کچھ دیر کے لیے مندمل کرنے کا ہنر ہی جانتی ہے۔ پیٹر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر

پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ اگر تم اُسے تندرست کر دو تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا.........؟’’ میری بات سن کر وہ سوداگر پلٹا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ‘‘تو گویا تم مجھے للکار رہے ہو۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کرو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔’’ گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک اپنی ہاری ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اُڑا رہا تھا، اُسے اُکسا رہا تھا کہ یا تو وہ گھٹنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی تھکن سے چور پلکیں اُٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اُصول بھول گیا تھا کہ ہارے ہوئے کو اتنا ہی ہرانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیونکہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی جنگ چھپی ہوتی ہے۔ پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے لیے نئے شگاف ہی کیوں نہ ملیں، سپاہی وہ جنگ لڑتا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ‘‘ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے تو یونہی سہی۔ میں تیار ہوں۔’’ گرو طنزیہ ہنسی ہنسا ‘‘اچھا.........تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کر لو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں تمہیں ہرا دیا۔’’ میں نے غور سے گرو کو دیکھا ‘‘علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع مت رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارتا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ تمہاری اس آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر’’۔ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا ‘‘اوہ، تو آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے کی دعوت قبول ہے۔ لیکن شرط اب بھی وہی ہے۔ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا ہوگی۔’’ میں نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ ‘‘ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے.........’’ ایمی گنگ سی کھڑی میری اور گرو کی یہ بحث سن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلتے ہی چلا پڑی۔ ‘‘یہ تم نے کیا کیا لڑکے! وہ، وہ بہت طاقتور ہے اور تم گھائل۔ یہ کیسا سودا کر لیا تم نے؟’’ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ‘‘کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے کرنا پڑتے ہیں۔ دلوں کے سودوں کی طرح، سدا گھاٹے والے’’۔ ایمی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیٹر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے، لیکن وہ ابھی تک بے چین تھی۔ ‘‘آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی ‘‘مناظرہ’’ کرنے کا ارادہ ہے.........؟’’ میرا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔ ‘‘میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے اپنی پوری زندگی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا، لیکن میں لڑے بنا ہار نہیں مان سکتا، کیونکہ اب معاملہ صرف میری ذات کا نہیں، بلکہ میرے ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے کمایا ہے، وہ ساری جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری داؤ کھیلنا ہی ہوگا’’۔ لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جوا بھی قبول نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایمی نے بتایا کہ پیٹر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اُسے اسی اسپتال کے انتقال خون والے شعبے کے وارڈ میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ گرو کے رُوحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایمی کی رپورٹ کے مطابق پیٹر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ

تشویش کی بات یہ تھی کہ پیٹر اب بھی بضد تھا کہ وہ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہمراہی اختیار کر لے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحے بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور جب ہم ان کے رُکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں، تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے لمحے پرواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آ پہنچی جس سے پرے کا سورج میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان لے کر آتا۔ مما اور پپا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہِ راست کوئی سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور مما میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ میں نے اُن کا اپنے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ''میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہا ہوں، جس کی ہار جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی کہ میں اب تک درست راستے پر تھا یا غلط.......... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہوگا۔ مگر افسوس مجھے یہ جنگل لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی یہ لڑائی لڑنا ہوگی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے اور بس''۔ پس منظر میں کھڑی مما میری بات سن کر رو پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں اس پل میرے مضبوط پاپا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگا لیا۔ جب کوئی بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہو تو رفو گری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لیتی ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار ڈھل جاتے ہیں۔ پپا بھی مجھ سے اپنی بھیگی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائے ''مجھے اپنے ساحر اور اس کے یقین پر خود سے زیادہ بھروسا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار.......... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔'' پپا مجھے تھپکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ کا بنیادی عنصر ''حوصلہ'' ہوتا ہے اور یہ ہمت حوصلہ ہمیں ہمارے ''اپنے'' دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل برسنے کو بے تاب تھے۔ آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ اپنوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھ ہی لیا تھا مگر وہ اوپر والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھالی اور پلکیں زمین پر بچھا کر سجدے میں جس قدر گڑگڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گڑگڑایا۔ ''یا خدا.......... تو جانتا ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سہی، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اُکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے نبی ﷺ کا واسطہ میری لاج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بھر دے میرے مالک.......... ''میں جس قدر گڑگڑاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی اتنی ہی تیزی سے بہتی۔ اُس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے مجھے آج تک بنا مانگے ہی سب کچھ جو

ملتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو ویسے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بس ''غوں غاں'' ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل جاتا ہے۔ ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اگلے ہی لمحے سب بھول بھال کر کسی چھوٹے بچے کی طرح صرف ''میٹھا'' مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔ یہ تو دینے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو، صرف ''میٹھے'' کے لالچیوں کو سب کی ضرورت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔

میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالانکہ دینے والے نے اپنے سب ہی خزانوں کے منہ کھول رکھے تھے۔

صبح لندن کا موسم بہت اداس تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر نئی قلعی پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے پرانی رضائی پر نیا لحاف اوڑھا دیا گیا ہو۔ سہ پہر تک ایمی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیٹر کی حالت ابھی تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گرو نے اپنی جنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گرو کی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو مما اور پاپا پہلے سے گاڑی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے، لہٰذا میں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گرو کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز اور مختلف ٹی وی چینلز کے مائیک دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں جانتا تھا کہ گرو اس موقع کی تشہیر سے نہیں چوکے گا۔ اُسے ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنے عقیدہ اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے لوگوں کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال کی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر بھی بھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زاویے اور فلیش کی چکا چوند سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے براہِ راست بھی نشر ہوگا۔ گرو پہلے سے اسٹیج پر مائیک سنبھالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے باآواز بلند تعارف کروایا۔ ''خواتین و حضرات .... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا، وہ اب ہمارے درمیان ہے''۔ سارے ہال پر پل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکانکی انداز میں میری طرف اُٹھ گئی۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے کھسکتی گئی۔ مناظرہ شروع ہو چکا تھا۔

* * *

مناظرہ

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی جس کے ذریعے ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی اسٹیج کا تمام منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تھام کر میری بیساکھی سنبھالتے، مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے مما اور پپا کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہیں لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ گرو نے ''عبداللہ'' کے نام سے میرا تعارف کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے فلیش کی چکا چوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے ہجوم کا بس ایک دھندلا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرو نے بات کا آغاز کیا۔ ''آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ کے لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی ہمت کا اعتراف کریں۔'' سارے ہال نے تالیاں بجا کر گرو کی بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نوجوان اور جوشیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرو کی فتح تسلیم کر چکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش اور بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ گرو کی تقریر جاری تھی۔ ''ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے وارد ہوتے ہیں اور وقت رُخصت بھی ہمارا زادِ راہ ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی لیکچرز میں وقت کا پہیہ رُک جانے کی حقیقت بیان کر چکا ہوں۔ اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صدی اور سالوں کا وقفہ ہے۔ وہی وقت قدرت کے پہیے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔'' گرو نے چھت پر فانوس کی صورت لٹکے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف کھینچی دو نیلی لکیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو لکیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اُوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس خدائے بزرگ و برتر کی عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اُوپر والی نیلی لکیر آسمان پر خدا کی خدائی کو بیان کرتی ہے، ٹھیک اِسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند کی مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہو گا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔ اُلٹی مثلث کے نیچے والی لکیر اس روئے اَرض پر موجود سمندروں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔'' بے خیالی میں میری نظر بھی گرو کی اُٹھی اُنگلی کے تعاقب میں اُٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو جھنڈے پر بنی ہوئی شبیہہ تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس شبیہہ کی توجیہہ سمجھ میں آئی۔ گرو کی بات ختم ہو رہی تھی۔ ''میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جب ہم اس سفر کے لیے روانہ ہوں، تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔'' تالیوں کی شدید گونج میں گرو اپنی

بات ختم کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا ہوگا اور اس کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ چاپ جمے رہنے پر کھانس کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلایا۔ ”آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرو لڑکے..........ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں“۔ تب میرا ماتھا ٹھنکا اور میں کچھ طنزیہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے وہی سناٹا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ ایسی محفل کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو ”آدابِ مناظرہ“ سے بھلا میری کیا واقفیت ہوگی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک طرح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں، در در کی ٹھوکریں کھاتا ہوا میں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثاثہ آج بھی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر اور اپنے خدا اور اُس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پہیہ تھمے گا اور ضرور تھمے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اُسے صلیب پر سے زندہ اُٹھا لینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور (مسیح) ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور سمندروں کا مالک بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا ”خدا“ ہے۔“ میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی شخص کا ہیولا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز اُبھری۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ”جیتے رہو ساحر، مجھے تم پر فخر ہے۔“ اور پھر پپا کی تالیوں کی آواز میں مما کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے۔ کیا ہوا جو پورے ہال میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے۔ کیمروں کا رُخ مما پپا کی طرف ہو گیا۔ ہال میں لگی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بہنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں تیز سرگوشیاں ہونے لگیں۔

گرو نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ”اب میں عبداللہ کو براہِ راست دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کروں؟“ ہال میں موجود سب ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ”میں نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں ثبوت یا کرشمے کے بنا، صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر میرا یقین سچا ہے تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے ذریعے میں لوگوں کو مسحور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرو نے رُوحانیات کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز، صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ لہٰذا میں پہلے گرو سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔“ گرو نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، ”تم نے تو لڑے بنا ہی آدھی بازی ہار دی۔“ ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ”تماشے“ کی اُمید میں گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددلی سی چھانے لگی۔ ہال میں لگے کیمرے اسکرین پر ناظرین کے تاثرات

جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے۔ پھر گرو کے عملے نے مریضوں کے نام اور اُن کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹیج پر آ کر گرو کی کرشماتی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہوگئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرو کی دو اُنگلیاں چھوتے ہی سارے درد، کھنچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرو نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آج کے دن کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یہیں اسٹیج پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں کی طبیعت سنبھلنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دُور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرو سے کہا کہ مجھے اُس کی مسیحا گری پر پورا یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد مما اور پپا کے چہرے کے تاثرات فوکس کر رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دنیا کے سامنے شکست کھاتا نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ ہر ماں کے لیے اُس کا بیٹا دُنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اُس کا لختِ جگر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے، لیکن ہال کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گالے گرتے نظر آ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور میرے دوست کوئٹہ جیسے پہاڑی علاقوں میں گزارے اپنے بچپن کے دسمبر کے دوران، ان برفیلی شاموں میں گھنٹوں سر جوڑے بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے لیے کتنے فرشتوں کی ''ڈیوٹی'' لگا رکھی ہوگی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے بوریوں میں بھر بھر لاتے ہوں گے، اور پھر کسی بہت بڑی چھلنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دُودھیا بادلوں ہی کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے وہ میرے بچپن کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے اب کہاں ہوں گے۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ گرو کی آواز نے مجھے پھر سے اسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفایاب کرنے کے بعد اب مجھے دعوت دے رہا تھا۔ تب، عین اسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ بھی میرے لیے کچھ ڈھو کر لایا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہوگئی، جتنی کبھی برف کے پہلے گالے کو پلکوں پر ٹھہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایمی ہی تھی جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے وہیل چیئر پر بیٹھے پیٹر کو اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

ہال کے سناٹے میں وہیل چیئر کے پہیوں کی آواز گونجی تو سب ہی کے کیمروں کا رُخ پیٹر اور ایمی کی جانب ہوگیا۔ گرو نے بھی چونک کر ایمی کی جانب دیکھا اور جلدی سے عملے کو اُس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ایمی، پیٹر سمیت اسٹیج پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرو کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے لب کھلے۔ ''میں گرو کے علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے گرو کے اس علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیونکہ اگر یہ ٹیلی پیتھی یا ہپناٹزم کی بھی کوئی شاخ ہے تو بہر حال لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرو سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو بھی شفایاب کر دے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیٹر خود گرو کا بہت بڑا پرستار اور پیروکار ہے اور گرو کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے اُمید ہے گرو میری یہ درخواست رد نہیں کرے گا''۔ گرو کے چہرے پر پیٹر کے ہال

میں آنے پر جو کرخت تاثر اُبھرا تھا، اب وہ ایک مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے بڑے بچوں کی کسی ”شرارت“ پر تنبیہہ کرنے کے لیے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ”میں عبداللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ رُوحانیات، انسان کو ان بیماریوں سے شفایاب کرنے کا نام ہے، جو کسی رُوحانی پیچیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے میں بھی انسان بظاہر کسی طبی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے اثرات، دل کی بیماریاں، ذہنی کشیدگی، جگر کی پراگندگی، بصارت و سماعت کا متاثر ہونا یا پھر معدے کے امراض وغیرہ، لیکن اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود رُوح کا گھائل ہونا یا رُوح کی بغاوت ہے۔ رُوحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں اور رُوح کے مندمل ہوتے ہی جسم کی بیماری خود بخود دُور ہو جاتی ہے، لیکن رُوحانی علاج کے ذریعے ہم خاص الخاص صرف جسمانی بیماریوں کو فوری رفع نہیں کر سکتے مثلاً اگر کوئی حادثہ جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے اندرونی اعضاء کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ ہاں، البتہ ایسی صورت میں رُوحانیات اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیٹر کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی بیماری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدائش ختم ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹر جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ کے طبی علاج سے کہیں زیادہ اس کا دارومدار میرے رُوحانی علاج پر رہی ہے۔ آج بھی میں رُوحانی عمل کے ذریعے پیٹر کی رُوح کو اس حد تک ضرور مندمل کر دوں گا کہ وہ اس ابتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی زندگی بنا کسی رُوحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے تو مجھے اُمید ہے کہ پیٹر آخر کار اس بیماری سے چھٹکارا پا ہی لے گا۔“ گرو نے زیرِ لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دو اُنگلیاں پیٹر کے ماتھے پر رکھ کر پھونکتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیٹر کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگی۔ ہال میں لگی برقی اسکرین پر پیٹر کا چہرہ اور لرزتی، دھیرے دھیرے کھلتی پلکوں کا منظر واضح تھا۔ گرو اب اپنی آنکھیں بند کر کے مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بنا لب ہلائے پیٹر کی رُوحانی مسیحا گری میں مشغول تھا۔ میں نے آج تک جتنی مرتبہ پیٹر کو دیکھا تھا۔ جانے کیوں ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیرِ اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم بھی تو جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیٹر سے پوچھا۔ ”اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو پیٹر..........؟“ پیٹر مسکرایا۔ وہ اب مکمل ہوش میں آ چکا تھا۔ ”میں پہلے سے بہت بہتر ہوں..........“ ہال نے پیٹر کی آواز سنتے ہی تالیوں کے شور سے آسمان پر سر پر اُٹھا لیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو ”تم مکمل ہار چکے ہو، لہٰذا اب ہتھیار ڈال دو“۔ میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چند لمحوں میں پیٹر کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کر دی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات لفظوں کی صورت میں نمایاں ہونے لگیں۔ پیٹر کو ابھی تک بخار تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اُس کے خون کا دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیٹر کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی تعداد بھی بیان کر دی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ گرو کچھ حیرت اور اُلجھن سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آ چکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے عقیدے کی دیواروں پر کھڑے ہو کر میں

نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد اُبھری۔ ’’تیرا ہی آسرا ہے میرے مولا‘‘۔ بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں چھپے کسی منافق اور چور سے درگزر کر، میری ریاکاری اور عیبوں کو صرفِ نظر کر دے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت جلوہ گر کر، اپنی رحمت کے صدقے، پیارے نبی ﷺ کی رحمت کے صدقے، میری اُمتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم الشان شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے ساری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حقیر ذرے جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اُسی رحمت کی ایک جھلک دکھلا دے میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ رکھ سکتا ہے۔ اپنے اس عاجز گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا.......... رحم کر.......... ’’میرا ایک ہاتھ پیٹر کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری تھی۔ میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور انہوں نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔ میرے لب تیزی سے اس وقت یہی ورد دُہرا رہے تھے.......... قل یا ایہا الکفرون.......... قل ھو اللہ احد.......... قل اعوذ برب الفلق.......... قل اعوذ برب الناس.......... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر ہل رہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیٹر کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان مشینوں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے پل پل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ ’’پیٹر کا دل ڈوب رہا ہے.......... اوہ میرے خدا..........‘‘ ہال میں سراسیمگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی عورت زور سے چلائی۔ ’’اس لڑکے کو روکو، یہ پیٹر کو مار دے گا۔‘‘ میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیٹر کی سانسیں اُکھڑنے لگیں۔ رُوح کے سفید اور کالے قابضوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایمی کے رونے کی آوازیں میری سماعتیں شل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد اُبھری۔ ’’مجھے تم پر بھروسا ہے عبداللہ۔ میں نے پیٹر کو تم پر قربان کیا۔‘‘ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید سیلاب کے دوران پانی چھوٹے نکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے۔ پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا ’’اوہ میرے خدا.......... بند کرو یہ سب کچھ.......... مگر.......... ٹھہرو..........‘‘ میری گزارش جاری رہی۔ ’’قل یاایہا الکفرون..........‘‘ ’’ارے یہ لڑکا تو اُبھر رہا ہے..........‘‘ ’’قُل ھو اللہ احد..........‘‘ ’’پیٹر کو جھٹکے لگ رہے ہیں..........‘‘ ’’قُل اعوذ برب الفلق‘‘ ’’پیٹر کا بخار کم ہو رہا ہے۔‘‘ ’’قُل اعوذ برب الناس..........‘‘ ’’پیٹر کا دل معمول پر آ گیا ہے۔ اُسے ہوش آ رہا ہے..........‘‘ میری التجا اور ہال کے ہجوم کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر ایمی زور سے چلائی.......... ’’یسوع مسیح کی قسم، پیٹر کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔‘‘ میں نے بے دم ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ جہاں پیٹر کی لحہ بہ لحہ بدلتی حالت کی تفصیل جگمگا رہی تھی۔ پیٹر وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر تھا۔ گرو کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا، پھر سب سے پہلے ایمی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے ہوئے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دُور سے میری ماں نے مجھے پکارا.......... ’’عبداللہ..........‘‘ میں نے بھیگی پلکوں

سے اُن کی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ مما نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود بھی زاروقطار رو رہی تھیں۔ لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا ادراک نہ تھا۔ مما نے دُور سے مجھے اپنی آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جب ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر کیوں نہ ہو پھر رفتہ رفتہ ہال کے پچھلے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رد نہیں ہوئی تھی۔ میرے سارے گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اُس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پیٹر کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور خود پیٹر بھی بھیگی پلکیں لیے حیرت زدہ سا گنگ کھڑا تھا۔ ایمی کبھی اُسے اپنے ساتھ لپٹاتی اور کبھی میرا سر اور ماتھا چومتی۔ مما سے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پپا بھی اُن کی تقلید میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمروں کے زاویے، فلش کی چکا چوند، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، بیک وقت سینکڑوں سوال.......... لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا.......... سراپا سوال.......... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اُس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی حد لامحدود ہونی چاہیے اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا چاہیے۔ جتنا کسی معصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ اگر مجھ جیسے نالی کے کیڑے کے لیے اُس کی رحمت کی یہ وسعت تھی تو پھر نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابر کس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل اسے ناپنے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر بمشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد شور تھما، میری آنسوؤں سے لرزتی آواز اُبھری۔ ’’شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اُسی اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی ہار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب بڑھنے کا اشارہ.......... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ.......... یہ کوئی معجزہ ہے نہ کوئی کرشمہ.......... یہ بس اُس کی بے کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اُس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی تلاش میں روشنی کے جگنو.......... اور یہ رحمت اور اُس کا کرم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اور میرا پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے.......... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے۔‘‘ میں اپنی بات ختم کر کے مما، پپا اور ایمی کو لیے اسٹیج سے اُترا تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سر اپنے کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ پپا لوگوں سے درخواست کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گرو آمنے سامنے آ گئے۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور آواز دبی ہوئی تھی۔

’’تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کون ہو..........؟‘‘ میں نے دُکھ اور حیرت سے اس گمراہ کو دیکھا، شاید دلوں کو آہنی پردوں سے ڈھک دیئے جانے کی ایک مثال میرے سامنے کھڑی تھی۔ گرو نے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز ہیجانی تھا۔

’’خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون ہو..........؟‘‘ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا ’’عبداللہ۔ اللہ کا بندہ..........‘‘ گرو اپنی جگہ جما رہ گیا اور ہم اسے ہٹا کر

ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک چکی تھیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اونچی عمارتوں پر لگی برقی اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال میں ہوئی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر البرٹ سمیت بہت سا عملہ استقبالیہ پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی تھیں اور میرا سارا بوجھ، اپنے جسم پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ایمی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ بھاگ کر سب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے چلتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ''آپ کے ملک سے آپ کے لیے ضروری فیکس آیا ہے۔ اس پر ارجنٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔'' پپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں، جس اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ اُن کی حالت ابتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک واپس پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔'' میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ ''کل صبح کی فلائٹ سے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا رد نہ کیجیے گا''۔ پپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم ڈاکٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود ہیتھرو ائرپورٹ کے ٹرمنل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اُترتے ہی میری پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ گرو تھا۔

✿……✿

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ایک اور عبداللہ

میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دُور کہیں پس منظر میں مجھے ایمی اور پیٹر کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے اسپتال کے سارے عملے سمیت ایک ہجوم بے کراں اس وقت ہیتھرو ائیر پورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری جانب بڑھا۔ ‘‘تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا تم کچھ دن مزید لندن میں بتاؤ گے تا کہ اپنی فتح کا لطف لے سکو.........لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمھیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت ہے۔’’ میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ‘‘تم اپنے ہر گزرتے دن کو یونہی فتح اور شکست کے پیمانے پر جانچتے رہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر ہے یہ حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔’’ میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک دیئے۔ ‘‘میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے لڑکے۔ اور میں آج تمھیں یہی بتانے کے لیے یہاں آیاں ہوں کہ میری اور تمہاری ایک آخری جنگ ابھی باقی ہے، اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی یروشلم میں۔’’ میں چونک کر پلٹا۔ ‘‘یروشلم میں.........؟’’ ‘‘ہاں، بیت المقدس میں۔ میرا گیان کہتا ہے کہ تم سے میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔’’ جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے اس زخمی بھیڑیئے کی ایک جھلک دکھائی دی، جس کے پنجوں سے عین اُس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کچھار میں معصوم میمنے کو چیر پھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو، اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے میمنے کی آواز سنائی دی۔ ‘‘عبداللہ.........تم لیٹ ہو رہے ہو مین۔’’ پیٹر اور ایمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دُور مما پپا، ڈاکٹر البرٹ اور عملے سے رُخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پپا کو میرے لیے برتی جانے والی ہدایات کی فہرست دہرانے میں مصروف تھے۔ ایمی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار کھڑی تھیں۔ جانے یہ بہنیں اتنا بہت سا نمکین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں ان کٹوروں میں۔ میں نے پیٹر کا کالر درست کیا ‘‘کیسے ہو کھلنڈرے لڑکے؟ اپنا بہت خیال رکھنا اور ایمی کا بھی’’۔ پیٹر کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ ‘‘وہ اب ایمی نہیں رہی، آمنہ بن چکی ہے۔’’ مجھے یوں لگا، جیسے سارا ائیر پورٹ ہی پل بھر میں رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ‘‘کیا.........؟ آمنہ.........’’ میں ایمی کی جانب پلٹا۔ اُس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ‘‘ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پالی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو دکھائی تھی۔ دعا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔’’ میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی۔ لیکن شاید تقدیر نے ابھی کچھ مزید اندھیرا اس کی تقدیر کے لیے بچا رکھا تھا۔ آمنہ نے پیٹر کا ہاتھ تھاما اور اُسے میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ ‘‘اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی۔ اس نے اپنے نام کا حق تمہارے لیے بچا رکھا ہے۔ تم ہی اس کا نیا نام تجویز کر دو۔ جو اس راہِ حق پر تا عمر اس کے ساتھ رہے۔’’ مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح روشنی سے بھر دی گئی ہو۔ نور کے جھماکے میرے چہرے

سے چھلک کر آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی منعکس ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرد الوداع کہنے والوں کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنج میں لگے اسپیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر رہے تھے۔ میں نے پیٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اُس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی پیتھی کے ذریعے سارے ایئر پورٹ کی بینائی اور سماعت سلب کر لیتا تا کہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں۔ لیکن آج گرو بے بس تھا کہ جب کرامتیں رُونما ہوں تو تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیٹر کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے نمی جذب کی۔ ''آج میں پیٹر کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عبداللہ.......... پیٹر آج سے عبداللہ ہے۔'' سارا ایئر پورٹ تالیوں سے گونج اُٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا ایک نیا جنم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و یہود کی اُن گلیوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اُس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فتنوں کی سازشوں کا جال بچھا تھا۔ میں نے رن وے سے ٹیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دُھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے یہی دعا کی کہ ''یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔''

ایئر ہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ٹانگوں پر پڑا کمبل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ تب ہی میری نظریں انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم سی گئیں۔ ''فلسطینی مسلمانوں کا قبلۂ اول کے اِردگرد ہوتی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروشلم کی سڑکوں پر مظاہرہ..........'' میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر دوڑائی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری رکھے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ''ہیکل سلیمانی'' کی تلاش تھی، صیہونیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ان کا مقدس ترین نشان یعنی ''ہیکل سلیمانی'' اِسی قبلۂ اول کے نیچے کہیں دفن ہے، لہٰذا اس تک پہنچنے کا ذریعہ بیت المقدس کی بنیادوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو ڈھانا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ''میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہو گی''۔ جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی محسوس کی، اور پھر اس بے چینی نے تب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پہیوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئر پورٹ سے نکلتے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو سی ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ سے سیدھے اسپتال پہنچے تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کومے میں ہیں۔ مما پاپا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال سے ٹلنے والا نہیں، لہٰذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہار سکتے تھے، لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی۔ اس لیے میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بنچ کے ساتھ ہی ٹکی ہوئی تھی، جہاں میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار میں شیشے کی قد آدم کھڑکیوں کا سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھیلتی ملگجی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے، طویل برآمدے میں بھی اُترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے دل سمیت سب کچھ ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال چاہے بھرپور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اُداس کر جاتا ہے۔ میں بھی اُس ڈھلتی شام میں اُداسی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نسوں میں اُترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے باہر کی جانب بل کھاتی اسپتال کی

مرکزی سڑک پر ایک شناسا سا چہرہ نظر آیا۔ کون تھا وہ؟ اچانک ذہن میں دوسرا جھماکا ہوا۔ ''ارے .... یہ تو انور تھا۔ زہرا کی مرسڈیز کا ڈرائیور۔'' میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں بیساکھی بھول بھال کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر بوکھلا سی گئی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی۔ لیکن اس وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر دُور تک بیساکھی ٹیکتا تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن آس پاس گزرتے چہروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے انور ہی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھنٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ کی جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے، اور میں تو سدا کا تقدیر کا مارا تھا۔ لہٰذا جس وقت میں زہرا کی کالی مرسڈیز کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک بی ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ میرا ہوا میں اُٹھا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا، لیکن گاڑی مجھ سے اتنی دُور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی پچھلی نشست پر میں نے کسی کا ہیولا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرا ہی ہو گی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے اور پارکنگ کے چمکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے، جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس ستم گر کے لیے میں ساری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دُور تھی، جتنی میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی، لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اُس کو میری خبر لینے سے بھی روکے رکھا۔ کہیں مما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے مجنوں کے لیے کون اپنی عمر برباد کرنے کو تیار ہو گا۔ فرزانگی کا یہی تقاضا ہو گا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اور پھر یہاں سے لندن جاتے وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاہد تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو مجنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم روک ہی لینے چاہئیں۔ لیکن کیا میری زہرا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے دُور چلا جاتا۔ آخر، اُس نے ساحر کو اتنا کمزور کیوں جانا۔ جب میں اپنی ہر سانس اُس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔ صرف ایک بار......... بس ایک بار وہ اپنے ابرو گرا کر اشارہ تو کرتی، میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر میرے اندر کی اُلجھی ڈوریں مزید اُلجھتی گئیں، جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک پہنچا، تب تک رات اسپتال کے در و دیوار پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور برقی قمقمے جلا کر اور ان کی نامکمل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے ''رات'' کو شکست دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ تو بھلا ازل کو کیسی شکست۔ میرے اندر کی رات بھی ازلی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگنوں کی طرح لپکی۔ ''آپ کے مریض کو ہوش آ رہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے'' میں تیزی سے اُٹھا۔ میری بیساکھی چکنے فرش پر پھسلی اور میں گرتے گرتے بچا۔

جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے تھے۔ میری بیساکھی پر اُن کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ عبداللہ بہت تھک گیا ہے۔ اسے اور نہ رُلائیں۔“ انہیں چپ کراتے کراتے خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو نقاہت کی وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اُن کی سرگوشی نما آواز اُبھری۔ کیا ہے۔ میاں.........؟ رُلاتے بھی خود ہو اور الزام بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے.........تب تب سو سو ہوتا ہے۔ تمہیں ابھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ ابھی سے عبداللہ تھک گیا تو پھر.........“ اُن کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جو اُن کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُن کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو پکارا۔

نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو پھر سے آکسیجن اور مختلف انجکشن اور ڈرپ کے کینولاز سے لاد دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا وہیں کمرے کے ایک کونے میں بے دم سا بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری رُوح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قید کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں رُوح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس فانی دُنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے بچھڑنے اور اُن کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں ساری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا بھگتتے دیکھتا رہا۔ اُن کی سانس رُک رُک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے پنجرے سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پھیپھڑوں میں بیک وقت ہزاروں چھریاں کھبتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے رُوح۔ شاید وہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری رُوح بھی نہ جانے کتنی بار، جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سنبھلی تو میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مما پاپا ناشتا لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مما کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئیں، لیکن اُن کی نظر جھکتی چلی گئی۔ اور میں اُن کے کچھ کہے بنا ہی سمجھ گیا کہ اُن کا زہرا سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں نے انور کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا میں مما کے اصرار پر چائے کے کچھ گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیل کر وہیں برآمدے کے بنچ پر اُن کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشیلی ہوتی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا درد کیوں نہ پل رہا ہو، تھپک تھپک کر بن بولوں والی میٹھی لوری سنا کر سلا ہی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے اپنے لاڈلے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی مورت بنے بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے ذرہ برابر بھی جنبش ہو جائے، ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ مما کے گالوں پر اُن کے بہتے آنسوؤں کی دھاریں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”آپ رو رہی تھیں۔ اتنی دیر ہو گئی مما۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں.........؟“ وہ مسکرا دیں۔ ”بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبداللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی.........؟“ مما

اب مجھے ساحر کی جگہ عبداللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بیٹے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اُسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ اُمید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بچھے ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سدا راہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا سکہ کشکول میں پڑے یا خالی کشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی کشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا اندر آنے والی ہر گاڑی کو اُسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چمکتے سکوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا سکہ چمکا۔ میں ہیجانی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لمبا سا موڑ کاٹا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا۔ جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اُسی گاڑی کے سامنے جا گرا۔ کار نے زور کی بریک لگائی۔ ڈرائیور غصے میں بکتا جھکتا گاڑی سے اُترا۔ “مرنے کا ارادہ ہے کیا؟” میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ “مار ہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے ہوئے نہ چھوڑ جانا..........” انور کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔ “ارے..........ساحر بابا..........آپ، یہ کیا حال بنا رکھا ہے، آپ نے” انور نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر میرے چہرے سے خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے رُومال بھی بنا دیتی جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اُسی بنچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا “ساحر بابا.......... یہ کیا..........؟ آپ ابھی تک..........؟” میری تلخی زبان پر آ ہی گئی۔ “ہاں..........میں ابھی تک معذور ہوں.......... کیا تم بھی اپنی مالکن کی طرح معذوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟” انور نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑے “میرے بچے آپ پر قربان ہوں ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے..........؟” پھر نہ جانے کیوں وہ خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا مدعا سمجھ گیا تھا۔ “کیا آپ کی زہرا بی بی سے ملاقات نہیں ہوئی؟” میں روہانسا ہو گیا۔ “نہیں انور..........تمہاری زہرا بی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے ایک بار ملوا سکتے ہو..........؟” انور کچھ دیر چپ رہا پھر اُس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرا کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار، کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور یہ سفید بی ایم ڈبلیو اُنہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے کر آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اُس سے زہرا کا پتا پوچھا، کیونکہ اُس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرا کے ابا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلا ہے، جو سالوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے اچانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کواڑ کھول کر پھر سے تازہ قلعی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سی سانس لی، تب ہی زہرا کے پرانے گھر پر ہمارا فون اُٹھانے والا بھی کوئی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چھلک جاتی تھیں۔ اُسے میرے ساحر سے عبداللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر رُکا تھا۔ میں نے انور سے زہرا کے دوسرے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ کچھ ہکلایا۔ “آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا.......... میرا مطلب ہے پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے”۔ میں نے غور سے انور کو دیکھا “تم جانتے ہو انور، میرا جنون اُس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی

چلوں وہ راستہ خود مجھے زہرا کی چوکھٹ پر پہنچادے گا۔ تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔" میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ساحر بابا.......... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تپش سے سخت فولاد کو پگھلتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آپ سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرا بی بی کی منگنی کی تیاری ہے وہاں پر.......... خرم میاں اسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ جائیں۔ اسی میں شاید سب کی بھلائی ہے۔" انور نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے کانوں میں وہ پہلے ہی ایک ایسا پگھلا سیسہ اُنڈیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سماعتوں کو اور کچھ سننے کا چارا ہی نہ تھا میں وہیں بیچ پر ڈھے گیا۔

……

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

جانشین

جاتے جاتے انور میری حالت کے پیشِ نظر مجھے زہرا کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا بلکہ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا اہم سفر تو اپنی راہ بدل چکا تھا، پھر وہاں جا کر اُس کی راہ کھوٹی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی دہائیاں دینے والے بہت بُرے لگتے تھے۔ جیسے وہ اپنے کسی اَن مول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی کیا، جسے رُو کر اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوٹا ہے تو پھر اپنے وفا کے چمکتے سکے کی بے حرمتی کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفائی کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔ چیخ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی رُسوائی کا تماشا دکھا کر خود کو کم ظرف ثابت کرنا مجھے گوارہ نہ تھا لیکن یہ دل.......... ہاں.......... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا پھینکتا ہے۔ ہماری خودداری، انا.......... ہمارا سب کچھ، اسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے۔ تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سودے سر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ ہمیں پھر سے اُسی بے چینی اور اُسی تڑپ کی ننگی برچھیوں کے جنگل میں لا پھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا ہی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خود اپنا آپ بیچ کر بھی ہم اس دلبر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں اتنی ذلت بھگت رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرا کی چوکھٹ کا رُخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی دوسرا پتا پھینک دیتا۔ ”نہیں، ضرور اُس کی کوئی مجبوری ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔“ میں پھر تڑپ کر کروٹ بدلتا۔ ”تو کیا مجھے ایک آخری بار اُس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہئیں..........؟ نہیں، اُسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آ کر تم سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبردار جو تم نے اُس جانب کا رُخ بھی کیا تو..........“ اِسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اندھیرے میں کیے گئے فیصلے دن کے اُجالے کے ساتھ ہی اُس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو مسل کر خوف، خدشات اور وسوسوں سے بھر دیتا ہے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار نے آ گھیرا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پپا نے میری بگڑی حالت دیکھی تو دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ مما ٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ کر نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے

لئے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی مار دیں تو اُن کی محبت کی معجزاتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک بخار نہ اُترا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے گا۔ شام تک میری حالت تو کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہ داری میں چلتے دیکھا۔ ارے.......... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں وہی پہلا عبداللہ جس نے اپنی گدی مجھے سونپی تھی اور پھر آخر میں نعمان.......... وہ جسے میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحل والی درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور بھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں اُن کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبیہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ حاکم بابا نے میرا ہاتھ تھام لیا "میرے جوگی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا شاید.......... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں"۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن پہلے عبداللہ نے میرا کاندھا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز کی نقاہت تھی۔ "آپ سب ایک ساتھ.......... یہاں کیسے..........؟" "ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں"۔ میں نے حیرت سے اُن سب کی طرف دیکھا "لیکن سلطان بابا تو.......... میرا مطلب ہے کہ کیسا حکم..........؟" مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا "اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت.......... ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاج مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رُخصت کرنے آئے ہیں"۔ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ "حجازِ مقدس، لیکن وہ تو بہت بیمار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے؟" حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ "فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نہ جانے اُن کے ہاتھوں میں کیسا جادو تھا کہ میں پل بھر ہی میں مدہوش سا ہو گیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود گرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دُور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دی" آنکھیں کھولو بیٹا۔ دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔" میں نے نقاہت کے بوجھ تلے دبے پپوٹوں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخار اُتر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، وہ سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا.......... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی مما سے پوچھا کہ "کیا ابھی کچھ دیر پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے..........؟" مما نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ اتنے میں نرس نے آ کر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقفہ کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر اُن کے بستر کے قریب پہنچا، مجھے دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرائے۔ میں نے اُن کے اشارے پر اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کر دیا، اُن کی آواز بمشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ "ساحر میاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رُخصت کر دو۔" میری بدحواسی فزوں تر ہو گئی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اس حالت میں کیسے جا سکتے ہیں اور پھر جانا طے ہی ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ۔ آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا؟" اُن کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دُور ہوتی گئی۔ "عبداللہ بھلا سلطان سے کب جدا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں یہاں ابھی

میرے بہت سے اُدھورے کام سرانجام دینا ہیں، لہٰذا تمہارا یہیں رُکنا ضروری ہے، اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آندھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی تمہارے قدم اُکھاڑنے کی کوشش بھرپور کرے گی، مگر تمہیں جمے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔" میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اُن کی ہتھیلیوں کی پشت بھیگتی چلی گئی۔ "لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہِ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا.........." اُن کی آواز ٹوٹ کر اُبھر رہی تھی۔ "کوئی بھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحر میاں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی جدائی ہوگی۔ سلطان بابا ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو بھی اپنے سحر کے حصار میں لے ہی لیا میاں۔ واقعی پکے ساحر ہو۔" میں اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی اُن کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا، اُن کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی۔ اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی اُلجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ صبح اُن کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ "صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے ہیں"۔ میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اُن کے منہ میں پانی ٹپکایا تھا، پھر یہ ڈاکٹر کیا اناپ شناپ بولے جا رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ "سعودیہ اسپتال کا فیکس آ گیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اب ان کے علاج کی آخری اُمید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس۔" سب کی نظر میری جانب اُٹھ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر ہنسوں یا اُن کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور اُن کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا، لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر اُن کے شاگرد کے طور پر دستخط کر دیئے اور ضمانت نامہ بھی بھر دیا کہ کسی بھی اَن ہونی کی ذمہ داری میری ہوگی۔ یہ نادان طبیب کیا جانیں کہ جو اَن ہونی ہونی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے جیسے میری رُوح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کومے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ اُن سے کیا وعدہ توڑ دوں اور اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اُسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا، لیکن ایمبولینس سے اُترتے ہی میرے دل کا یہ چور بھی پکڑا گیا۔

مریضوں کے لیے بنائی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رن وے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اسی غیر مرئی نظام کا حصہ بنتا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے اِردگرد اور اُن کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا

اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔ کتنا بے بس تھا میں، اس لمحے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ سلطان بابا نے خدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس.......... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گا، لہٰذا انہوں نے چپ سادھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھپکتے رہے۔ کچھ سفر آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں۔ صرف ایک میں ہی ہوں ان سب میں ایسا کم ظرف تھا جسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی.......... ”الوداع..........“ کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے خلا پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورتِ حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اس پرانے ساحر کی یاد نے شدت سے آ گھیرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرا کی سلگتی یادوں کے انگاروں کی آنچ اور حدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی یاد آیا کہ وہ جھپٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جبکہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے دیکھ کر بھی ہونٹ سیئے بیٹھا تھا۔ آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ وہ اطمینان سے اُس کی محبت کو چھین کر لے جاتا۔ وہ زہرا کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرا کا ہاتھ، کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس لوٹتا۔ لیکن یہ کیسا المیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبداللہ نام کی عاجزی سے باندھ رکھی تھیں۔ جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں تو ہمارا جھگڑا، ہمارے خدا سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائز لگنے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دُور یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اُسی طرح منا لے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو جانے پر ہماری ماں مناتی ہے۔ بالوں میں اُنگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رُو کر.......... میں بھی اپنے خدا سے ناراض سا بنا کھانا کھائے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میسر نہ ہو پھر انسان خود اپنے آپ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا کسی اور دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہٰذا میں خود ہی اپنی رُوح کو غم، دُکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے کب نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا میرے پلکیں موندنے کے انتظار ہی میں میری پتلیوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ اُن کا لباس سفید اور تسبیح کا رنگ دُودھیا تھا۔ دُور پس منظر میں سبز گنبد کی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلافِ معمول بے حد تازگی اور بشاشت کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے تر و تازہ لہجے میں مجھے اُسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا جو اس دنیا میں بس اُنہی کا خاصہ تھا۔ ”کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس لڑائی کو روک بھی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر پل لہولہان کیے رکھتے ہو۔“ میرے لہجے میں شکوہ تھا ”آپ کو اس سے کیا..........؟ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے نا.......... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پکڑے بنا ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا۔ پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان میں بھٹکتا چھوڑ کر چل دیئے۔“ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ”پرندے کو پرواز سکھانے کے لیے اُس کے اپنے شہپر کو بھی ایک مرتبہ اُسے چوٹی سے نیچے پھینکنا ہی پڑتا ہے۔ یہ اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب

آتی چٹانیں، زمین کی کشش اور آندھی جیسی چنگھاڑتی آوازیں اس شاہین بچے کو اپنے پنکھ پھڑ پھڑانے پر مجبور کر ہی دیتی ہیں۔'' میں گڑگڑایا'' لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیئے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق کیا دیں گے آپ۔ میری اُڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔ اب میرا مقدر صرف چوٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے۔ فنا ہی میرا مقدر ہے، لیکن افسوس کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کندھا تو دے جاتے''۔ میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آ گئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پوری رات میں کروٹیں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں نے ہڑ بڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا تو مما اور پپا دونوں ہی تاریک چہرے لیے باہر موجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ '' کیا ہوا..........؟'' مما نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز اندر ہی گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں'' میں نے پپا کو پکڑ کر جھنجوڑا.......... '' خدا کے لیے کچھ تو بولیں.......... '' پاپا نے میرے کاندھے زور سے تھام لیے۔ '' ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے درمیان نہیں رہے.......... '' میری سماعتیں شل ہو گئیں۔ اس کے بعد پپا نہ جانے کیا بولتے رہے مجھے صرف اُن کے لب ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھیتے وقت دروازے کی چوکھٹ میرے سر سے ٹکرائی بھی تھی، کیونکہ میں نے مما کو جلدی سے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر سر پر پٹی باندھتے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی۔ کیا میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر میں واقعی بڑا '' کم ظرف'' تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اُسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پپا سے وہ لفظ سنے تھے، لیکن حیف مجھ پر کہ میں اب بھی پپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ '' ساحر ہوش میں آؤ۔ مولوی خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نمازِ جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص حکم ہے، وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی آخری خواہش ہو۔'' لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قابل ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دو نوکروں کی مدد سے سنبھالے اپنی گاڑی میں درگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ انہونیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی درپیش آنے کے بعد اُتنا ہی بڑا اعصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں یہ بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ اُن کا آخری سفر ہے، لیکن اُن کی قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی رُخصتی کا ٹھیک وہی وقت تھا جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی بات گونجی۔ '' یاد رہے یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دُوری ہو گی۔'' لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا۔ میں ابھی رُوح کی حدوں تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے مجھے کس نے صحن میں وہیں بٹھا دیا جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب ہر جانب وہی نظر آ رہے تھے، پھر یہ لوگ اُن کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آواز کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی '' سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے.......... '' '' سوگ.......... '' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا '' کیسا سوگ.......... '' '' آج یہ سب کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔'' ظہر کی نماز شروع ہوئی تو کسی نے مجھے بھی صف میں لا کھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نمازِ جنازہ کی نیت بھی باندھ لی

گئی۔ کبھی کسی نے زندوں کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبداللہ، مولوی خضر اور کچھ انجان لوگ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ پپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے کون بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ پپا سے کہوں کہ آج رات ہی ٹکٹ کروا لیں۔ میں بابا کے پاس سعودیہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد مولوی خضر نے حجرے سے ایک کاغذ منگوایا اور دھیرے سے بولے ”سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت چاہوں گا۔“ پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو اُن کی وصیت کے مطابق بانٹتے گئے۔ کسی کے حصے میں تسبیح آئی تو کسی کو اُن کا جائے نماز ملا۔ کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی.......... ”اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق اُن کے جانشین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جانشین اُسے مقرر کیا ہے جو اُن کے مطابق سب سے زیادہ اس اعزاز کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں.......... سلطان بابا کے عبداللہ..........“ میرے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔

❁ ❁

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فریفتہ

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر رک گئیں اور فضا میں تیرتے پرندے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جانشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے میری جانب یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اُن کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے۔ پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوت گویائی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گفتگو میرے اندر پنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چپکی رہنا چاہیے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتنا بڑا بوجھ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونڈنے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکل کر درگاہ کے چکنے فرش پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے "ارے.......... یہ کیا عبداللہ میاں.......... یہ آنسو..........؟" بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی بند خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ میلے میں اپنوں سے بچھڑ کر تب روتا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام جھولے اور ٹھیلے سنسان ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھاتا اندھیرا اُسے ڈرانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں میں ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے چپ کراتے کراتے سب ہی نڈھال ہونے لگے اور پپا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو روتا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ہمارا رونا اُن دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعمت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے رونے میں پہل سے ہچکچاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پپا نے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا، جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زمان و مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں جڑا ہے یا پھر کسی مکان کی طاق میں.......... البتہ پپا اس کلیے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی فرار کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو، انہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کسی بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند میرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہٰذا.......... آنکھیں بند کرتے ہی میری رُوح کے بند کواڑ

کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی میلاد کی محفل میں پایا۔ سب ہی چپ چاپ ورد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہی تھیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے اُن کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی اُن ہی کے ساتھ فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر دن چڑھ کر اُترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن سوتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سودا ذہن میں سمایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس.........بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ مما تین چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلاوا بھیجا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں چپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی تو کچھ تنہائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شریر، لیکن نامکمل ٹکڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد رُوٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھپکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہڑ کی طرح تیزی سے پلٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپیں کنویں تک آتی پگ ڈنڈی پر نہ گونجی ہوں اور اب وہ بےچاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھر لوٹ رہی ہو کہ گھر کے آنگن میں ٹہلتے بابل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”مخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں.........لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا لیتا جاؤں۔“ میں نے چونک کر نظریں اُٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص مؤدب سا سر جھکائے میرے قریب کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر چیچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اُڑے ہوئے تھے۔ گہرا سانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بےزاری چھپانے کی کوشش کی اور مولوی خضر کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود زائرین میں نیاز بٹوانے میں مشغول تھے۔ ”آپ اُن صاحب سے مل لیں۔ وہ میرے اُستاد بھی ہیں اور وہی اس درگاہ میں اس وقت سب سے معمر اور قابلِ احترام شخصیت ہیں۔ وہ آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو دعا دینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ وہ شخص اپنی جگہ جما رہا۔ ”جی.........میں پہلے اُن ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

دیکھیے، آپ مجھے ٹالیے گا نہیں۔ میں بڑی دُور سے یہاں تک آیا ہوں۔'' میں نے حیرت سے پہلے اُسے اور پھر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ ذمہ داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے وہ شخص ٹلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اُس سے پوچھا ''آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن آپ کے لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت..........؟'' وہ شخص کچھ ہچکچایا ''کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی ڈھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا پتا دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔'' میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اُس کی جانب پلٹ چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا، تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے اپنا گلا تر کیا اور بمشکل بولا ''میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں ''فریفتہ'' ہوں۔'' میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''جی..........؟'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے، میں ''فریفتہ صفت'' ہوں۔'' میں اب بھی نہیں سمجھا۔'' اُس نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''جی مجھے اندازہ ہے۔ دراصل یہ بات ہی اتنی اُلجھی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری ''بخت'' سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھے، لیکن تب یہ چیچک کے داغ میرے چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تحفہ ہے۔ البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے ہزاروں لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بھر میں بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیوار بنی ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبے دہکا رکھے تھے۔ بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں دسویں جماعت میں ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہنا شروع کر دیے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور متاثر کرتی ہے۔ میرا دل خوب صورت چہروں کے اِردگرد گھنٹوں منڈلانے کے لیے مچل مچل جاتا تھا، لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حد درجہ عام، بلکہ کسی حد تک بھدی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستیں اور میری بُردباری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے کسے جاتے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا تو میں بزمِ ادب کا منتظم منتخب ہو گیا۔ تب تک میری شخصیت کے برعکس میری شاعری کافی نکھر چکی تھی۔ اُردو شعبے میں میری کافی دھاک بیٹھ گئی اور جونیئر لڑکیاں میرے لفظوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھیں۔ لیکن یہ ساری عزت میری شعروں کی مرہونِ منت تھی۔ خود میرا وجود اُن کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امر بیل کی طرح پھیلتی چلی گئی، لیکن پوری یونیورسٹی میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری کلاس کی گل لالہ بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی۔ جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے سب ہی لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اُس کی راہ میں پلکیں بچھائے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ میرا دل بھی گل لالہ کے لیے اِسی شدت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس، نہ شکل و صورت، نہ روپیہ پیسہ اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بدقسمتی سے اُسے شعر و ادب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہٰذا یونیورسٹی کے چار سالوں

میں چار مرتبہ بھی میری اُس سے بات نہیں ہو پائی، لیکن میرا وحشی دل مزید وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جاگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی لت پڑ گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے اردگرد خوب صورت چہروں کا جمگھٹا ہے اور میں ان سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو یونیورسٹی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرما رہا ہے، تو کبھی پوری محفل لوٹ لینے والا موسیقار یا گلوکار بن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا۔ لیکن میری ہر مہم جوئی کا انعام صرف مہ رُخوں کا کوئی جھرمٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور میں سب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے یا کسی ایک گل رُخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بیک وقت کئی نازنینائیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں۔ لیکن خواب تو پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر نکلتا تو میری عام سی شخصیت میرا منہ چڑاتی۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اُس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بارہا کرتے ہیں، لیکن کسی مرد کی کم تر شخصیت اور اس سے جڑے دُکھوں کو آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی، اور مرد بھی کیسا.......... مجھ جیسا ”فریفتہ صفت“.......... جسے ہر لمحہ کسی پری رُخ کے عارض پر پھیلتے گلال کے گلابی پن کی ضرورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بدکردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت تھی، جو ہر لمحہ میرے چار سُو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدوں سے بھی کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ پر افسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ ان تقاریب میں سب سے پہلے پہنچ جاتا، جہاں کسی بھی اچھے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی اُمید ہوتی۔ بظاہر میں لاپرواہ سا بنا اس محفل میں ٹہلتا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم یہی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ محفل کا سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشے گی، جب خود اُس مہ جبیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اُردو شاعری میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلا لے.......... لیکن افسوس میرا خواب پورا نہ ہو سکا اور آخر کار گھر والوں کی پسند سے میری شادی ہو گئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور نیک دل عورت تھی۔ پر، وہ کبھی مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کر سکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار اُس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چیچک کے داغوں کا تحفہ میرا منتظر تھا۔ بیماری کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لئے دبئی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ پیسہ ہاتھ آنے کے بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیسہ مرد کی تمام بدصورتیاں چھپا لیتا ہے۔ دس سال میں نے دن رات بھلا کر دبئی کے ریگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ملک لوٹا تو ایک رئیس تھا۔ میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں کئی ادبی و سماجی تنظیموں کا اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہر کی کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور پر کما چکا تھا، لیکن محبت کی ایک نظر اب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر کا طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچا دیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سفر اس اُمید پر کرتا کہ شاید میری ساتھ والی نشست

پر کوئی حسینہ بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس ہی میری طرف نظر بھر کر دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کروا لیتا کہ شاید میری طبیب یا نرس ہی وہ چہرہ ہوں جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر کٹ گئی۔ میں جان بوجھ کر اپنے اردگرد کسی نہ کسی بہانے حسین چہروں کا جمگھٹا لگائے رکھتا، مگر کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھنکار سنائی نہ دی۔ کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی پجارنیں نکلیں........ میرا پیسہ بھی میری ادھوری اور بدصورت شخصیت کو مکمل نہ کرسکا۔ میں سدا سانول ہی رہا، کبھی ساجن نہ بن سکا۔ اور آج زندگی کی 68 خزائیں جھیلنے کے بعد بھی میں یہاں اس دعا کی اُمید سے کھڑا ہوں، جو میرے وحشی من کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کر دے۔ میں بے حد نڈھال ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ”فریفتہ پن“ میری جان کا روگ بن چکا ہے۔ یہ دنیا، بدصورت لوگوں کے لیے بڑی بدصورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت نے میرا من اتنا کومل ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو بھی اتنا ہی شگفتہ کیوں نہ بنایا........؟ قدرت نے میرے وجود کے سب ہی تاروں کو اگر سر اور موسیقی کی مدھر تانوں سے جوڑ کر نسوں میں عجب ہیجان خیز خواب دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر ہی دی تھی، تو پھر بے ڈھنگی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری تباہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا قصور ہے۔ جانے یہ میلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے اندر سب کچھ اتھل پتھل کیسے کر دیتی ہے۔ میں پل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری قدرت میرے سامنے دو زانو ہو جاتی ہے۔ پریاں رقص کرتی ہیں اور میرے روم روم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ ہی سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دس فی صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اِندر اور باہر صرف ایک شودر ہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی جگہ نہیں........“ بختیار اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تھکن تو ساری زندگی کی تھی۔ اندھیرا ڈھل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے دو آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں کی طرح دکھائی دیے، جو کسی گم نام کے ویران مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس تھکے ہوئے معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اُسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو فریفتہ نہیں ہے۔ کوئی عورت پر فریفتہ ہے تو کوئی جاہ وچشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے تو کوئی سونے کے محلوں پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی ”فریفتہ صفت“ ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار پر پوری اُترتی ہے انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس تڑپ اور کسک کی کانٹوں بھری خلش اور لاحاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ کہے بنا دعا کے لیے ہاتھ تو اُٹھا دیے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میرے پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ دعاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے دوبارہ یہاں آئے گا۔ اس کے جاتے ہی مجھے مما درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پپا کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے اُن کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سناتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پپا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی مما کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے

تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کر پائیں۔ ”ساحر........ آج میری زہرا سے ملاقات ہوئی تھی........“ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لہجے میں ایک عجیب سی بے گانگی تھی۔ ”اچھا........؟“ مما کچھ دیر چپ رہی، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ زہرا کی پرانی ہمسائی کو خصوصی تاکید کر چکی تھیں کہ جب بھی زہرا کے گھر والے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں تو مما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی ہمسائی ہی نے مما کو بتائی تھی کہ زہرا کے گھر والے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی مما کو اس ہمسائی کا فون آ گیا کہ اُس نے ابھی ابھی ڈرائیور سمیت زہرا کی گاڑی کو اُن کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ مما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں تو زہرا واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ مما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے اُن سے ملی۔ البتہ مما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اُس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ ”شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں۔ اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بہتر ہوگا کہ ساحر بھی اس ان ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔“ لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاہی سے جوڑ دیتے ہیں؟ مما اُس کے سامنے بہت روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ بس ایک بار ہی مجھ سے مل لے تاکہ ساحر کے وحشی من کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرا نے بھیگی آنکھوں سمیت مما کی یہ درخواست بھی نامنظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں مما کو اُس کی بے رُخی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اُس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچنے والی ہے۔ لہٰذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ مما اپنی بات ختم کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرا نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے مکروہ بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔ میں نے پپا کے کوٹ کی جیب میں اٹکا پین نکالا اور قریب پڑے ایک کاغذ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے........“ پتا نہیں یہ نظم تھی، نثر تھی، یا پھر صرف چند بھٹکے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو........ تمہاری وفا پہ مجھ کو........

یوں تو پورا یقین ہے........

پر........ زمانے کے وار کا کچھ بھروسا نہیں ہے

سو گر کبھی ایسا ہو جائے........ اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے........

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا........ جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے........ بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا راستہ؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا........ جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدہیئت ویرانی سے........ بھلا ان خوب صورت نظاروں کو کیا واسطہ؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا........ جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں
کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ........ بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ؟
ان خوابوں سے نفرت مت کرنا........ جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے
کہ کسی ''پیکرِ بدنصیب'' کے گھناؤنے پن سے........ بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ؟
بس مجھ ہی سے نفرت کرنا........ کہ میری رُوح کی سیاہی سے ہی........ چار سو یہ اندھیرا ہے
میری بدصورتی کی وجہ سے ہی........ دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے........ ہر راہ بے راہ ہے
ہر نظارہ مکروہ ہے........ ہر خواب سراب ہے
بس مجھ سے ہی نفرت کرنا........ کہ صرف میں........ اور بس میں ہی تھا........ تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں''

ساحر

میں نے کاغذ لفافے میں ڈال کر اور اس پر زہرا کا پتا لکھ کر پپا کی جانب بڑھا دیا۔ ''اس پر زہرا کا پتا لکھا ہوا ہے۔ ایک اور احسان کر دیں مجھ پر، گھر واپسی پر یہ لفافہ اُس کے گھر دیتے جایئے گا........ آج اس فسانے کا اختتام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے........'' مما پپا کے چہرے سفید پڑ گئے۔

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے''

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن اور رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور میں زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، گھنٹوں کھڑا رہتا اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خاک سے جُڑا رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھا نہ لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا تھا، لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و حواس چھن جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید بھی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ کر نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جانب پلٹ چکے تھے۔ لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جان نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب بھی میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی ویرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیونکہ اب میرا ان انسانوں کی محفل میں گزارہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا، اتنا ہی مجھے اُن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید ان مزاروں پر ''پہلو تہی'' انسان کو مزید مُعتبر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پپا میرا خط لے کر زہرا کے در تک پہنچے تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پپا نے اُس سے زہرا کا پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پپا نے اُسے میرا رقعہ دے کر زہرا تک پہنچانے کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب اُن کی گاڑی زہرا کی حویلی کو مڑنے والی سڑک کے موڑ تک پہنچی تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک کی جانب آتے دیکھا تھا لیکن میری التجا کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرا کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے براہِ راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالانکہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آنے والی زہرا ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار سماعتوں میں زہرا کے نام کا امرت اُنڈیلا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان بابا کا انتظار کرتا، مختلف محفلوں اور ویرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھے نہ ملتے۔ ہاں البتہ اُن کے پیغام کبھی کبھار مجھ تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار اُن کے ہاتھ کے لکھے پرانے اوراق مجھے حجرے میں یا درگاہ کے کسی اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو اُن کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھی، مگر دوسری یا تیسری مرتبہ پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کچھ کاغذ پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے حجرے کی پرانی انگیٹھی کے پیچھے سے صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دھول اور کالک میں اَٹا ملا۔ میں نے اُسے جھاڑ کر صاف کیا اور اُس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا ''جب جب جو جو ہونا ہے............تب تب سو سو............'' تحریر کچھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ میں نے بہت دفعہ سلطان بابا کو مختلف رُقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذ یوں ایک ایک کر کے بعد میں مجھے

ہی ملتے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پرچیاں سینت سینت کر سنبھال رکھتا۔ میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔ میں نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑھے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی کوشش کی ''عصر کا وقت اہم ہے.......... کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے.......... دھیان رہے.......... سائل نہ چوکے..........'' بس اتنا ہی سمجھ آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سائل کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے خود ہی سے اُلجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی خضر چند سائلوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اُکتاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اُوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک پہنچا دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا، شاید قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی۔ ابھی مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دُعا مانگے بنا ہی اُٹھ کر چل دیے اور ٹھیک اُسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی خضر کو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے دیکھ کر جلدی سے صف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی انہوں نے دُعا کر لی۔ دُعا کے خاتمے کے بعد اُٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔ باقی نمازیوں کے جانے کے بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیوں میاں، دیکھا تم نے محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کسے ملا..........؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''دُعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے۔ شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دُعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو دو اشخاص نماز پڑھ کر بنا دُعا مانگے اُٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی پر انعام لیے بنا ہی چل دیے، اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دُعا میں شامل ہو گئے، انہوں نے محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام اُن کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دُعا میں اپنا حصہ مانگنے کا موقع مل گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دُعا ہو، جس میں دُعائیں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں..........'' مولوی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا.......... میں بھی شاید وہ سجدہ قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو گنتی بھی اب محال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔ تحصیل ماہی کے مجذوب کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کب تھا؟ عصر کے بعد مولوی خضر حجرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے، اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے کی ناکام کوشش کرنے درگاہ کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اُونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میری جانب بڑھی۔ ''سنو لڑکے! یہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں..........؟'' شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ''وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے، کیا خدمت کر سکتا ہوں، میں آپ کی..........؟'' وہ کچھ ہچکچائی۔ ''تم.......... میرا مطلب ہے تم

تو......... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ سے درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے سیڑھیوں تک چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے خصوصی دُعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آ سکتا۔” مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے لاڈلے کے لیے دُعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ مما مجھے پکارتی رہ جاتیں لیکن اگر میرا کہیں جانے کا موڈ نہ ہوتا میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ ہی کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا مدعا پھر سے بیان کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور اُن کو بتایا ”یہ عبداللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔ بہر حال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں“۔ عورت کے چہرے پر حیرت کے تاثرات اُبھرے ”تو یہ عبداللہ ہے؟“ میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آ کر ٹھہر گیا، کیونکہ میں چاہتا تھا کہ سائل کی خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اُس لڑکے کے لیے دُعا کریں۔ کیونکہ یہ اُن کے اعتماد اور یقین کا معاملہ تھا اور دُعا بنا کامل یقین کب اپنا اثر دکھاتی ہے، لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اُتر چکے اور انہوں مجھے ہم قدم نہیں پایا تو وہ بھی ٹھٹھک کر رُک گئے ”عبداللہ میاں......... آپ نہیں آئیں گے، میرے ساتھ ان کے صاجزادے کو دُعا دینے.........؟“ مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی دمکتی کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈفون لگائے کسی نغمے کی دُھن پر اپنی اُنگلیوں کی تال ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیئرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے اپنی ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ”شہزاد بیٹا......... یہ بزرگ تمہیں دُعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے.........“ شہزاد مسکرایا ”واہ......... کیا بات ہے۔ کیا، آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے سی ایس ایس یا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے لگے ہیں۔ آئی مین، ہی از کوائٹ ینگ فار اینی چچ پلیس مام۔“ ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہ کی۔ مولوی خضر نے بنا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے کھڑے شہزاد کے لیے دُعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جما بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو ماں نے ممنونیت سے ہمیں دُعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ جو ماں ہمیں دُعا دے رہی تھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے دُعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دُعاؤں پر اک ذرا سا اعتماد بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دُعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دُعا بھلا کیا ہو گی؟ ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا ”آپ نے خواہ مخواہ اتنی دُور آ کر اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دُعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس ویرانے میں نہ پڑے ہوتے۔“ میں سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلافِ معمول اور خلافِ توقع نہ جانے مولوی خضر کیوں رُک گئے اور انہوں نے شدھ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔ ”دُعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ کوئی دُعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دُعا کے لیے ان ویرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے، میری دُعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔“

ہم شہزاد اور اُس کی ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر اُوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن

میں نے حسب عادت انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے اندر وہی اک عجیب سی بے چینی سرایت کرنے لگی، جو اب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی، لیکن آج بہت دنوں کے بعد زہرا کی یاد کا وہ مستقل کانٹا سرِشام ہی ٹیس دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بے اختیار رونا آ گیا اور نہ جانے کب حجرے کی دیوار سے ٹیک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں روتا ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھٹنوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رو رہا تھا، تبھی مجھے اپنے سر کے اوپر کسی کے ہاتھ کا مانوس شفقت بھرا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اُٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے۔ ہاں……… وہی تو تھے، لیکن میں تو اُن سے روٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر کے رُوٹھا سا بیٹھا رہا۔ اُن کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ سجی ہوئی تھی ”یہ کیا ساحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی نہیں کرو گے کیا، اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟“ میں نے اُن کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی ”آپ جانتے ہیں کہ آپ کے بنا میری ہر جیت، ہار ہے۔ اور جانے آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کر لیں ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے………؟ واپسی کا راستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزلِ مقصود تک جاتی ہے۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو زہرا کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہہ میں جا لیٹنا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سیپیاں اور گھونگھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔ ”جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں، انہیں زیادہ مخمصے نہیں ستاتے۔ اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اُٹھ ہی جائیں گے۔“ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی منڈیر کے پاس گھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اب بھی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اِسی جگہ میرے دل پر اب بھی اُسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اُسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جاتی تھی، لیکن یہ گرہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں، کیونکہ مجھے سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے صحن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کیونکہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیونکہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری

ابتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اُن کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے ”عبداللہ میاں.......... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے بیٹے کے لیے میرے ساتھ دُعا کی تھی نا۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے، اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیا تھا تو کہیں یہ اُسی کیے کی سزا تو نہیں ملی اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دُعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بددُعا نام کا کوئی بھی سکہ ہمارے کشکول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے اِن کے ساتھ اِن کے گھر ہو آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اُس نوجوان کو پلا دینا۔ انشاء اللہ افاقہ ہو جائے گا“۔ مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلافِ معمول ضرور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالانکہ نہ جانے کیوں میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا متوقع برتاؤ بھی میرے پیشِ نظر تھا، لیکن میں صرف تعمیل کرنا جانتا تھا، لہٰذا پانی کی بوتل اُٹھائے چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، تو مکینوں کی نفاست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باڑھ ہی سے ہو گیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ ہم مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ سامنے بستر پر شہزاد جسم پر ایک بڑا سا لحاف ڈالے پڑا، بخار میں تپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ یو اینگری مین! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم ممی کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی گریڈ کرنے کی حماقت کی تھی، مجھے اُسی وقت تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بھی میری بات سمجھ گئے ہو۔ لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہو سکے تو میری معذرت قبول کر لو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑ چڑا بنا دیا ہے۔“ ”میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ بھول جاؤ سب کچھ.......... یہ پانی پی لو.......... انشاء اللہ افاقہ ہوگا..........“ شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ ”تمہیں سچ بتاؤں.......... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس ممی کی وجہ سے..........“ شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہہ کی۔ شہزاد با دلِ نخواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی ”بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا پگلا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کہہ کر ابھی آئی“۔ میں نے جلدی سے انہیں روکا، نہیں نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں..........اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق چند دُعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلیف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔“ لیکن مائیں بھلا کب کسی کی سنتی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے باوجود خاصا تکلف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لیٹا ہی رہا۔ میں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُعا ختم ہونے کے بعد اُس کا سوال ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ”کیا تمہیں اپنی دُعا پر پورا یقین ہے..........؟“ میں نے غور سے اُسے دیکھا ”جب تک دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھتے نہیں، تب تک میں بھی اُتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو۔ لیکن ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھنے کے بعد نہ جانے کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ ہاتھ گرنے سے پہلے سارا جہاں اپنی ان دو جڑی ہتھیلیوں کے پیالے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم

بھی آزمانا۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے گا۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری..........؟" شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری" کہتے ہیں جس کو عشق.......... خلل ہے دماغ کا.......... بس یوں سمجھ لو کہ یہی خلل دماغ کی چولیں ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے من میں بھی سما گیا ہے۔ بولو.......... ہے کوئی دُعا تمہارے پاس اس خلل کو رفع کرنے کے لیے..........؟" میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منع کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی اِن بل کھاتی پگ ڈنڈیوں پر واپسی کے راستوں میں گھنے جنگل اُگ آتے ہیں۔ دُکھ کی امر بیل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لپٹتی ہے کہ پھر کوئی مڑنا بھی چاہے تو واپسی کا کوئی راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے عفریت ان گھنے جنگلوں میں سرشام ہی امل تاس کے پیڑوں سے نیچے اُتر آتے ہیں اور واپسی کے بھٹکتے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے باسیوں کے لیے پل بھر میں اُس برفیلے گلیشیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے گھل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار سبھی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے چیختے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے ٹائی ٹینک کی طرح..........

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی ممی کے کھنکارنے کی آواز سن کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی ٹرالی دھکیلتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مُسکراتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ "کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ عشق لاعلاج ہوتا ہے۔ اس جرثومے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے رُوحانی علاج کی حدیں آزما دیکھو۔" شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا "شیری! تم باز نہیں آؤ گے نا۔ کیوں مہمان کو زچ کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔" خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلافِ توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیلے اور واپسی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا۔ "پھر کب ملاقات ہوگی پیر جی.........." میں جانتا تھا کہ "پیر جی" کی اصطلاح صرف اُس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ "جلد ہوگی، لیکن پہلے تمہارے اس خلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں، حالانکہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات جرثومے کے زہر کا شکار ہو کر مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت چھوت کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔" شہزاد کی ممی حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی، اس گفتگو کو سن رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ "اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی خدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آنگن میں بہار بن کر اُترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرا بیٹا سدا کا پگلا ہے۔" شہزاد نے مسکرا اپنی ماں کو دیکھا اور تکیے کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے سے جیسے اپنے آپ سے بولا.........."اُن کے دیکھنے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق.........." ماں نے ہنس کر بیٹے سے تصویر لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر

مجھ سے بولیں .... "بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے گا کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دُعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی بہو کو لے کر درگاہ آؤں گی........."

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری جھجکتی سی نظریں ماں کے ہاتھوں میں پکڑی بہو کی تصویر پر پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھماکا ہوا اور زمین شق ہو گئی۔ میں چکرا کر زمین پر گر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزادو کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرا کی تصویر پر ہی جمی رہی۔ ہاں .... وہ زہرا ہی تھی .... جو کبھی میری تھی۔

❀......❀

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

''دوسرا رقیب''

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس میں بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا تو شہزاد کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف کھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کر لوں، لیکن میں نے بمشکل اُن سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہٰذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لرزش ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب لا کر اُتار دیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے زہرا کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اُس نے تو زہرا کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا۔ تو پھر یہ شہزاد...........؟ میں فوراً واپس پلٹا۔ ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ''یہ جو لڑکا بیمار تھا...........اُس کا پورا نام کیا ہے...........؟'' ڈرائیور چونکا ''کون...........چھوٹے صاحب۔ ان کا نام شہزاد ہے...........خرم شہزاد...........'' ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے...........؟ میں تو آج بھی اُتنا ہی تہی دامن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر صحن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر حجرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں بمشکل خود کو کسی طرح گھسیٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی انہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرا کسی اور کی ہونے والی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اُسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی اُمید کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آنا ہوتا ہے...........وہ آ کر ہی رہتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی آ چکا تھا اور کیسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید اُن کے لیے طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہڑکتا رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بہتی شبنم درگاہ کی زمین پر کہرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی، لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدھم اور کالک زدہ تھا۔ مجھے جس کی مسیحائی کے لیے چنا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق تو اپنے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کروانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں تھا کہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری اُمید کا گلاب بھی اپنے رقیب کے حوالے کر دے اور اُس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پرو کر لہولہان اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے صحن میں

دُھول میں اٹا بیٹھا تھا، دُھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ماتھا چوما تو مولوی خضر حجرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفان دبانے کی کوشش کی ”آپ جانتے تھے کہ خرم شہزادی زہرا کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا، اُس کی تیمارداری کے لیے.........؟ کیا آپ کو بھی عبداللہ کو بار بار تپتی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے بھسم کیوں نہیں کر دیا جاتا ہے۔ یہ روز روز کے سلگتے داغ میری رُوح کو کب تک سہنا ہوں گے.........؟“ شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہو گیا لیکن مولوی خضر حسب عادت چپ چاپ سر جھکائے سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے بولتے میرا گلا رُندھ گیا اور ازل سے بھیگی پلکیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اُٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ”یقین جانو، عبداللہ میاں......... میرے بس میں ہوتا تو یہ ساری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا لیکن تمہاری رُوح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا۔ پر ہم دوسروں کے نصیب مول پاتے تو بات ہی کیا تھی۔ بس، اتنا سمجھو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور ہم شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی دُعا کی کنجی سے بھی کچھ بند تالے کھول نہیں پاتے.........“ مولوی خضر یونہی چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھپکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آگھیرا تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات اجنبی ہجوم بھی ذہن کی اُلجھی گرہیں اٹکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی میرے قدم تیسری سیڑھی ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اُن کا ڈرائیور بھی اُن کے پیچھے چلا آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جلدی سے میری جانب بڑھیں ”عبداللہ......... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا.........؟“ میں رُک گیا۔ ”جی......... بس ذرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹہل آؤں.........“ انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ”اوہ......... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ”اب اسی حالت میں مجھے آرام ملتا ہے۔“ لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سلے ہی رہے۔ مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکریہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ اُس کے بقول اس ”کرشماتی پانی“ کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آیا تھا۔ مولوی خضر مسکرائے اور بولے ”اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اُس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر پھونکی تھیں۔ اور یہ عمل آپ خود اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا“۔ خرم کی والدہ میری جانب مڑیں۔ ”وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب بھی وقت ملے تو ہماری طرف ضرور چکر لگانا۔ مجھے خوشی ہوگی“۔ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آواز بھرا سی گئی ”ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اُس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں، جب زہرا خرم شہزاد کی دلہن

بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے اُس دن میرے پگلے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان اُبھرے گی اور اُس کی زندگی کا ہر درد ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا“۔ زہرا کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آندھیاں چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کمزور تنکے کی طرح اُڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں، جسے زہرا نصیب ہو جائے، پھر بھلا اُسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں..........؟ کبھی وہ میرے مقدر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی منڈیر پر چنک جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے پیپل کے پیڑ سے لپٹ کر اُس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدر سے گلہ کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرا تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی رُوح سونپنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اُسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آ چکا ہے، لہٰذا میں چاہوں تو زہرا کا ہاتھ تھام کر واپس پلٹ سکتا ہوں۔ میں نے تبھی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو دستر خوان پر بچھے رزق کی طرح ہوتا ہے، اُسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے تو اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدر رُوٹھ جاتے ہیں، کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ لیکن میں بھلا کب ناشکرا تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے تو وہ بھی بلاوجہ کے تو نہیں تھے۔ زہرا کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اُس کی مخمل پلکوں کو اپنی راہ میں بچھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آبگینے جیسے نازک بھرم اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی دہائی ہم اوروں کو دیتے پھرتے ہیں۔ میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرا پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ”نادان دوست“ کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا۔ زہرا اگر میرا انتظار نہیں کر پائی تو کیا ہوا۔ اُس نے بھی ایک بار مجھے اپنی رُوح سونپی تھی۔ کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کومل رُوح کے پرزے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اُس ایک جاوداں پل ہی میں گزار دیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سمیٹنے کی دُھن میں اتنی دُور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے؟ خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اُن کے مستقبل کے سنہرے سپنوں کی داستان میں اپنا آج جلتے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار سیر ہو چکنے کے بعد پھر سے پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دُعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں پھنکنے لگا۔ بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بیک وقت جھیلنے کی سکت رکھتا تھا، لیکن یہ حدت تو میری رُوح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ اس عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج بے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اُسی بادِ نسیم کے معطر اور یخ جھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوشبو تھی، جو اُس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل

مہندی کا رنگ سجنے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرا کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اُس وقت صحن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ مولوی خضر ''ارے...........ارے'' ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے صحن میں داخلی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنسان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''کیا ہوا میاں...........کس کی راہ دیکھ رہے ہو...........؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''وہ...........جس کی راہ کی ڈھول بننا میرا مقدر ٹھہر چکا ہے۔'' مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا۔ ''لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے، میاں...........'' میرے دل نے آج تک پہلے بھی اُس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی، لیکن آج درگاہ کا سنسان دروازہ میرا یہ بچا کھچا اور آخری مان بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔ میر نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بہنے لگا اور تبھی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اُس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا پنجر توڑ کر باہر آ جائے گا۔ ہاں!...........وہ زہرا ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں ملبوس۔ ویسے ہی جیسے پانیوں پر تیرتی ہوئی راج ہنسنی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا۔ زہرا کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو، یا پھر درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات اُلٹ دی تھی۔ وہی پلکوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے خرم کی والدہ کے پیچھے مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں۔ یا شاید ہمارا دُوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دُوریوں کا بھلا فاصلوں سے کیا واسطہ۔ ٹھیک اُسی لمحے مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور اُن کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آ گھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبوں اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ''دُوری'' کہتے ہیں لیکن رُوح سے رُوح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے وہ ''آگ'' کہلاتی ہے، لیکن جو رُوح کو جھلسائے اُسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہو اُسے ''لفظ'' کہتے ہیں، لیکن جو بن بولے اور بن سنے ہی رُوح کو جھنجھوڑ جائے اُس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرا کی رُوح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ رُوح جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرائے کے تصرف کے بوجھ تلے دبی نظر آ رہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں۔ ''آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب...........یہ تو یہاں آنے کے لیے بھی راضی ہی نہ ہوتیں، اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی ضرور آتا۔ لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دُعا کریں کہ ان کی آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے تو دُعا کریں کہ وہ بھی پوری اور بھرپور ملے۔'' مولوی خضر ہلکے سے بولے ''بی بی میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کم یابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہو وہ ''خوشی'' نہیں رہتی۔ معمول بن جاتی ہے۔'' مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی

والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ”یہ تو یہاں کبھی نہ آتی اگر خرم ضد نہ کرتا............“ گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں بلکہ اُس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھی۔ مولوی خضر نے دُعا ختم کر کے زہرا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”سدا سکھی رہو............“ خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹتے پلٹتے رُک گئیں۔ ”ارے ہاں عبداللہ بیٹا! وہ تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔ اُس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو نا۔ خرم تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمھیں واپس چھوڑ جائے گا............“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی ”عبداللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بُری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے تو میں خود لے کر آؤں گا آپ کے دولت خانے پر............“ جانے یہ میرا وہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا تو اُس بے رحم کی جھکی پلکوں کی جھالر میں ارتعاش کی اک لہر سی پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہوگئیں اور انہوں نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا ”ہاں بخار تو بڑا تیز ہے۔ عبداللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج کیوں نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے............؟“ اور یہی وہ لمحہ تھا جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان پھسل ہی گئی۔ ”وفا کا روگ ہے مجھے............ آپ دُعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا مرہم عطا کرے۔“ خاتون نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح پچھتایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران ہی تیر پھسل جائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی اُس کانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرا کی پلکیں اُٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھے گیا۔ میری کہانی کا آغاز بھی اِسی درگاہ سے اور زہرا کی اُٹھی ایک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی وہ ایک نظر تھی۔ پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس پلٹ گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا میرے نوحے پڑھتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بٹھا دیا اور کہیں سے ایک کمبل لا کر میرے لرزتے جسم پر ڈھک دیا، پر رُوح کی لرزش کا کیا علاج............؟ اتنے میں میرے قریب ہی قدموں کی آہٹ اُبھری اور شام کے ملگجے اندھیرے میں کوئی سایہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ مجھ میں گردن اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا دیے۔ میں نے چہرہ پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا۔ ہاں............ وہی ”فریفتہ نصیب“ بختیار............ لیکن آج اس کے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آ رہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھرپور تھا۔ ”آپ کی ایک دُعا نے میری زندگی بدل دی............ مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر اُمید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچا دیا، جہاں میں نے سب پا لیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے ہیجان آمیز خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اُسے پوری کائنات کھوجنے کے بعد وہ اک نگاہ میسر ہو ہی گئی، جو صرف اور صرف اُس کی مدح سرائی میں اُٹھی اور پھر اُسی کے لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول وہ ایک مجسمہ ساز تھی، جس کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اُس کے مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا تو بختیار کو بھی بطور مہمانِ خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تبھی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس حسین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ اسی فریفتہ پن ہی کا تو شکار تھا۔ لیکن یہ معاملہ تب ”خلافِ معمول“ تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی

زبانی اپنے فن کی تعریف سن کر شرماتے اور کچھ جھجکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کر لی۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ، بختیار کی مصروفیات کے پیش نظر اُس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری ہی میں اُس نے کچی مٹی اور کلے سے بختیار کا بت تراشنا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلستی روح پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اُسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات اور شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اسی لیے اُس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی سے فرمائش کر کے اُس کا مجسمہ گوندھے۔ آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول اُس نے آج تک کبھی اپنے آپ پر پیار آتا محسوس نہیں کیا تھا کہ سائرہ کے کمال فن نے اُسے بھی اتنا حسین کر دیا کہ خود بختیار کئی گھنٹے اپنے چہرے کے زاویے اور خط سراہتا رہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دُعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اُس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھ پاتی۔ میں نے بختیار کی جانب دیکھا۔ ’’کاش میں اتنا معتبر ہوتا کہ میری دُعائیں بھی قبولیت کا شرف پاتیں۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔‘‘ بختیار کچھ ہچکچایا۔ ’’ہاں، مگر ابھی ایک اُلجھن باقی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دعا کریں گے۔‘‘ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا ’’کیسی اُلجھن.........؟‘‘ بختیار نے نظریں چرائیں۔ ’’آپ یہ دُعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بینائی نہ لوٹائے.........‘‘ میرے اندر ایک زوردار چھناکا ہوا اور میری رگوں اور نسوں میں وہ سب کانچ دُور تک پیوست ہو گیا۔ ’’کیا.........؟ کیا مطلب.........کیا سائرہ نابینا ہے.........مگر.........مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آپ کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر.........؟‘‘ بختیار نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا ’’ہاں.........یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ نابینا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بینائی ہی سے ہو.........؟‘‘ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا وہ۔ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف ’’بینا نظر‘‘ ہی لکھی ہو؟ بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔ ’’وہ اپنی اُنگلیوں سے چھو کر دیکھتی ہے۔ قسمت نے اُس کی انگلیوں کی پوروں میں اُس کی بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اُس نے اپنی پوروں کی بینائی سے چھو کر اور محسوس کر کے گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا۔ کوئی سلوٹ، کوئی بدنما زاویہ نہیں تھا۔ مجھے اُسی شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی مجھ جیسے بدہیئتوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ کاش میں بھی سائرہ کی طرح نابینا ہوتا اور قدرت میری اُنگلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت بینائی عطا کر دیتی.........کاش.........‘‘ بختیار بولے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بددُعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیونکہ اُسے خوف تھا کہ بینائی لوٹ آنے کے بعد اُس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی۔ پھر سے وہی نفرت اُس کا مقدر ہو گی، جو جنم سے اب تک اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی آئی ہے۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ڈاکٹروں کے حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی۔ بات صرف اُس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی تھی اور بختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش شدید خود غرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی لیکن وہ بے بس تھا۔ شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود غرضی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے

خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ میرے لیے دُعا کریں گے نا............ دیکھیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجیے گا واپس............ “ ”آپ نے ٹھیک کہا............ نظر کا بھلا بینائی سے کیا واسطہ............ ؟“ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بینا وہ نظر نہیں رکھتے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک نظر بھی عطا کر دے۔“ وہ بے چین سا ہو گیا۔ ”بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی پوروں والی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بدصورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بدنما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کر پائے گی۔“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ٹھیک ہے............ لیکن دُعائیں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس نہیں پلٹا کرتیں۔ اس لئے دُعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام تک دوبارہ سوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بددُعا کی عرضی بھی ڈال دیں گے۔“ اچانک میرے عقب سے وہی رُوح کھینچ لینے والی ملائم سی آواز اُبھری ”اگر بددُعا ہی کسی سیاہ نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے تو ایک بددُعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔“

میں تڑپ کر پلٹا............ درگاہ کے دروازے کے قریب زہرا کھڑی تھی۔

* * *

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش

تارِ عنکبوت

ہاں .... وہ زہرا ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ لیکن وہ تعبیر تھی۔ میرے نہ سہی .... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی .... لیکن زہرا یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلے یہاں ....؟“ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں بھی حیرت کی جھلک تھی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر زہرا کے لیے جگہ خالی کی اور زہرا میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی ”لرزشِ بے کراں“ میرے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اُس کے لب ہلے ”خرم کی امی آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ اُوپر تک نہیں آ سکتے اس لیے ....“ میرے اندر زور کا جھکڑ چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا آخری پتا بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا رقیب لکھے گا۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا ”معافی چاہتا ہوں .... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بد دعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو دعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اُٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے۔ اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔“ زہرا نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کچھ ہڑبڑا سا گیا ”جی جی .... ضرور کیوں نہیں .... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ سائل کی سن لیں ....“ ”جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون ....؟“ بختیار میری بات سن کر اُٹھتے اُٹھتے ایک بار پھر ٹھٹھک گیا اور پھر موقعے کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرا درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرا کی لرزتی پلکیں کچھ نم سی ہونے لگیں۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا ”چلیں .... میں حاضر ہوں“۔ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرا کی آواز نے میرا تعاقب کیا ”سنیں ....“ میں رُک گیا، لیکن پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ طلسم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر کا بنا دیتا ہے۔ ”میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیونکہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہیں آتی۔ لیکن ساری بات ہی اختیار کی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔“ کاش وہ اتنی سی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ اُنہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور تڑپ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپتا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری کا حیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ ایسے

میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تر دیوانے اور کسی شہزادے / امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ کرنا ہو تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے کسی مضبوط شانے کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے‘‘۔ میں نے اپنی ترکش کے سبھی تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھائل کی آخری ڈوبتی آواز سنائی دی ’’آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے ہوئے میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔‘‘ زہرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا، ایک تہ شدہ ورق میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ ’’نفرت‘‘ محبت کا سب سے خطرناک روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اُتر کر زہرا کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اُتر آئیں، لیکن خرم حسبِ معمول گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آج بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے آج پیلاہٹ جھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ’’بڑے مغرور ہو میرے مسیحا۔ آخر مجھے ہی یہاں تک آنا پڑا۔‘‘ خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی۔ ’’شہزاد...... تمیز سے......‘‘ تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا سنجیدہ ہوتیں تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ ’’میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے۔ سب مان، سارے غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گہنے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔‘‘ خرم نے چونک کر میری آنکھوں میں جھانکا ’’سوری...... میرا مقصد تمہارا دل دُکھانا نہیں تھا عبداللہ، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابلِ فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے۔ جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔‘‘ خرم نے مسکرا کر زہرا کی جانب دیکھا۔ وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹتے اور تاج بدلتے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اُوپر درگاہ ہی پر لے چلیں تا کہ مولوی صاحب ہی اُس کو وہ پانی بھی پلا دیں، لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا تردّد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دو گھڑی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آ جائے تا کہ مولوی خضر سے بھی اُس کی ملاقات ہو جائے۔ خرم بھی کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت سا مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرا کے چہرے پر بھی کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر خرم نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی ’’اچھا چلو...... آج ہم بھی یہ معرکہ سر کر ہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر پھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی دو قدم چل کر اُوپر نہیں آ سکتا۔‘‘ خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اُتر کر خرم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی چیز نکالی اور خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مصنوعی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم

کوگاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اُسے تھمادیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا کر پہلا قدم اُٹھایا۔ میں سوچنے سمجھنے سمیت اپنے تمام حواس کھو چکا تھا۔ گویا خرم اپنی اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کار کے کلچ اور ایکسیلیٹر کا وہ مخصوص خودکار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نصب کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈگمگاتے ہوئے دوسرا قدم اُٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اتنے میں اُوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''ارے میاں......... تم وہیں رُکو میں نیچے آرہا ہوں''۔ مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئے اور انہوں نے وہیں کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جوان دو قدموں کے سفر ہی میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''میں نے کہا تھا نا......... میرے پاس فخر کرنے کی بس ایک ہی وجہ رہ گئی ہے۔ لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کافی ہے۔'' ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بیٹھادیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرا ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانسے، میں جیسے کسی خواب کے اثر سے نکل کر ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ ہوا میں اُٹھا رہ گیا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اُڑتی ریت کے ساتھ دُھول ہوتا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مولوی خضر نے مجھے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھنکار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس میں تھا ہی کب.........؟ کاش دنیا کے سبھی دیوانوں کے ماتھے پر قدرت ہوش چھینتے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُن کی جبیں پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا اُن سے کسی ادب و آداب یا تہذیب کی کوئی اُمید نہ رکھتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزتے قدموں کو سنبھالتا واپس درگاہ کے صحن تک پہنچا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید......... اسی لیے ان کے چنگھاڑنے اور لڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس شور سے کئی گناہ زیادہ شور اس وقت خود میرے وجود کے سمندر میں اُٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور۔ شاید بہت شدید اور حدوں کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی ساعت میں میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے زہرا کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرا کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر نامہ ''خط'' ہی ہو، یا ہر ''خط'' کسی کی تحریر ہی سے جڑا ہوا؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ''خط'' لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ ان سیاہ موتیوں پر پھسلنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اُتر جانے والی تحریر اور وہی اندازِ تکلم۔ کون کہتا ہے کہ ثبات صرف اک تغیر کو ہے.........؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے بمشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔

''میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں پھول بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرو دونگی، ایسا بھلا کب سوچا تھا.........؟ آپ کی ہر

بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا تو شاید میں انہی بدگمانیوں کے تپتے سائے تلے اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیونکہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔'' میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرا کی کہانی ٹھیک اُسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اُس دن ''کا سابلانکا'' کو زہرا کے شہر اُسی ساحل پر لنگر انداز ہونا تھا، جہاں اُس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرا کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرا کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہی تو وہ ساحل تھا جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لنگر انداز ہو کر زہرا کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرا کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کاٹے تھے۔ لیکن آج کا دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لنگر انداز ہونے والا تھا مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال ہا سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرا بھی بمشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دوپہر آنے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دُھن میں اتنی سرشار تھی کہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک سپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش اُس کی گاڑی کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیلمٹ پہنے یہ نوجوان گزشتہ چند روز سے زہرا کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی زہرا ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی تو وہ اُس وقت تک زہرا کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرا سے پہلے زہرا کے ڈرائیور نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور اُس نے ایک آدھ بار رُک کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے، لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اُترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زوردار ایکسیلیٹر کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرا کی توجہ بھی اس جانب مبذول کروائی، اُلجھن تو زہرا کو بھی ہوئی مگر اُس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرا نے خود گھر سے نکلنا کم کر دیا اور اگر کسی اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا، تو وہ دن کے اُجالے ہی میں کام نمٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے کی کرتی، لیکن اُس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اُسے ہوش تب آیا، جب اُس نے ایک قدرے ویران سڑک پر اُسی نیلے رنگ کی ہیوی سپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ زہرا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کیونکہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی تھی اور اُسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اُس کی گاڑی کے پچھلے بمپر سے بالکل چھوتے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرا نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی، مگر فاصلہ بڑھنے کی بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرا کا پاؤں ایکسیلیٹر پر دبتا چلا گیا اور مرسیڈیز کا بھرپور طاقت ور انجن اپنے وحشی زور کے بل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک مصروف سڑک پر موڑ کاٹتے ہی اچانک اشارہ سرخ ہو گیا تو زہرا سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ عجلت میں لگائی گئی بریک نے مرسڈیز کے چاروں پہیے تو تارکول کی سڑک پر پیوست کر دیے لیکن گاڑی کی بقیہ باڈی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بُری طرح جھول کر گھومی اور پیچھے سے آتی ہیوی بائیک زوردار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے

دروازے والی طرف سے ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اُچھلا جیسے کسی توپ سے نکلا کوئی گولا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا، گاڑی کے اُوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دھم سے گر کر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اُس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ سوار نے کسمسا کر اپنا وجود بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن کار رُکتے رُکتے بھی اس کی گھائل ٹانگوں کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اُڑے اور زہرا جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زوردار طریقے سے اسٹیرنگ سے ٹکرا چکا تھا، یہ سب دیکھ کر وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی اور جب اُسے ہوش آیا تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ شہر کے معروف ہسپتال کے آئی سی یو میں اپنے پریشان والدین اور ڈاکٹروں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ساحر کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر نے زہرا کو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ ضرور ساحر نے زہرا کے گھر پر بھی رابطے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اُسے تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرا نے ڈاکٹروں سے پہلا سوال اُس سپورٹس بائیک والے گھائل کے بارے میں پوچھا لیکن جواب میں اُسے نیند کا انجکشن ملا اور زہرا اپنے سر میں اُٹھتی ٹیسوں سمیت پھر سے غافل ہو گئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب دوسری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرا کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے جنوں کے آخری دور سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا، لیکن زہرا کے المیے کا آخر ابھی لکھا جانا باقی تھا۔ ایک نئی قیامت اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اُس کی گاڑی سے ٹکرا کر گرنے والا موٹر سائیکل سوار موت و زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس پلٹتے ہیں اور یہ دیکھ کر زہرا کی رُوح ہی اُس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے غائب تھیں۔ کار نے اس بُری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ذرا سا مزید انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کا باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اُس کے نڈھال سے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرا تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرا کی تیز رفتاری اور اچانک بریک تھی لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر کے بڑے متمول تھے اور براہِ راست زہرا کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ اُن کے بڑے خاندان اور رُتبے سے واقف تھے۔ خرم نے بھی پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرا کی نہیں تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتار کا عادی تھا۔ زہرا کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر خرم کا خاندان جذبات میں آ کر زہرا کے خلاف کوئی شکایت درج کرا دیتا تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں اپنے تیروں کا نشانہ بناتا، لیکن یہ اُن کی بھی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا پالا ظرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر اگلے کے ظرف کا بوجھ اُٹھانا بھی تو صرف ظرف والوں ہی کا خاصہ ہے۔

جبھی تو زہرا کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو، اُن کا دُکھ کوئی کیا ناپے......؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی، وہ تیز رفتار کا دلدادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم آگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی زندہ دلی اور ہمت پر کہ اُس نے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد

ہونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر اُس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی کوئی نہیں سنبھال پائے گا، لیکن ابھی کسی اور کے من آئینے میں دراڑ آنا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر ہر دعا بددعا میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خرم نے پہلی تنہائی پاتے ہی زہرا کو بتا دیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اُس کی کوٹھی کے چکر کاٹتا رہا ہے۔ خرم نے زہرا کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک بڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ زہرا کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن اُس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوندا اور پل بھر میں ہی سب بھسم کر گیا، لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اُس پہلی نظر کا انجام اُس کی ازلی معذوری کی صورت نکلے گا۔ خرم کی حالت حادثے کے دن سے لے کر اب تک بنتی بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طویل آپریشن نے اُس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن زہرا کو دیکھتے ہی اُس کے اندر پھر سے جینے کی خواہش جاگ اُٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں خرم نے زہرا سے اُس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی بہرحال زہرا کو میسر تھی اور خرم نے "نہ" کا حق بھی اُسے تفویض کر دیا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ حق اور یہ "اختیار" خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ زہرا ابھی خرم کو یہ بتا بھی نہیں پائی تھی کہ اُس کی روح پہلے ہی ساحر کی راہ میں پلکیں بچھائی منتظر ہے، کیونکہ خرم کی بنتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرا نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرا کی سب سے بڑی مجبوری بنتی چلی گئی، کیونکہ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں اُس کی اس حالت کا ذمہ دار خود ہی کو سمجھتی تھی۔ حالانکہ خرم نے خود اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد وہ خود کو کسی طور پر بھی زہرا کے قابل نہیں سمجھتا اور زہرا کے انکار کا اُسے صدمہ ضرور ہو گا پر اچنبھا نہیں۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرا تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے وسیلے ہی سے پہنچے اور زہرا یہ چاہتی تھی کہ وہ خرم کو اُنہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اُس کی "نہ" کی وجہ خرم کی معذوری نہیں کوئی "اور" ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ اَن کہی رہ جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ زہرا انہیں کچھ بتا پاتی، خرم کی ماں نے اُس کی تازہ طبی رپورٹ زہرا کے سامنے رکھ دی، جس میں واضح درج تھا کہ خرم کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اُس کی قوتِ ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اُس کا بیٹا اب زندگی کی طرف تبھی لوٹ پائے گا، جب اُسے دوسرے کنارے پر زہرا اپنا انتظار کرتی ملے گی، ورنہ خرم کا بخار اب اُس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی دن خرم کی مسلسل اور لگاتار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرا اسی شش و پنج میں تھی کہ ہسپتال سے خرم کی والدہ کے لیے جلد پہنچنے کا پیغام آ گیا کیونکہ خرم کی سانس پھر سے اُکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے تو اس ابتر حالت میں بھی زہرا کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہی خرم کی ماں سسک پڑی اور اُس نے زہرا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ زہرا نے روتے ہوئے اُن کے جڑے ہاتھ کھول کر اپنے مقدر کے بھی دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔ زہرا کے والدین کے ہاتھ تو حادثے والے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے لیکن زہرا نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی کہ ماضی کے سنہری دھاگوں سے ناطہ توڑنے کے لیے شہر والی کوٹھی چھوڑ کر مضافات والی حویلی میں بسیرا ڈالا جائے۔ پرانے گھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرا کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ

ساحر کو یہ سب بتا کر اس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاموشی سے سب کچھ سہہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آنے تک خود کو کہیں چھپا لے۔ بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ بھڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر رشتہ جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرا نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اس میں اُسے سب کا بھلا نظر آیا۔ لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرا کا سامنا ایک بار پھر ساحر سے ہونا بھی تو اس مقدر نے طے کیا تھا۔" میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرا کا خط تہہ کیا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں برستی بارش میں درگاہ کے صحن میں بیٹھا بھیگتا رہا اور زہرا کی تحریر کے لفظ ڈھل کر صحن میں بہتے چلے گئے۔" کاش میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی کچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے ڈھل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اُسی مجذوب کی پیش گوئی گونجی

"تجھے خدا ہی ملے گا.............. نہ وصالِ صنم.............."

✿.......✿

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

http://kitaabghar.com

دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے

زہرا کی تحریر نے ایک ہی پل میں میرے اندر کی ساری دنیا تلپٹ کردی۔ سینہ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا مگر اس کاغذ نے رہا سہا بھی سب اُلٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اس وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ میں آج تک جتنے بھی انقلابات رُونما ہوئے ہیں، وہ سب اسی ایک لمحے کی کایا پلٹ کا کرشمہ ہیں۔ پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بدنصیب اس لمحے کا شکار ہو کر پُرسکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو بپھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرا دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں میرے اندر یہ سوال شدت سے اُبھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرا کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا؟ میں نے زہرا کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک تہ شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، جسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اُسی بے خیالی میں رقعے کی تہ کھولی اور اندر لکھی تحریر نے میری رُوح کا آخری ریشہ بھی اُدھیڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبانے لگی ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے........“ نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرا کی تھی۔ اُس نے دوبارہ وہی سطریں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔ ”سنو........ تمہاری وفا پر مجھ کو........ یوں تو پورا یقین ہے........ مگر........“ میرے اندر کا شور بڑھتا گیا........ ”سو، گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے تو اُن راہوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے........“ تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا........؟ ”ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں........ اُن خوابوں سے نفرت مت کرنا........ جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے........“ مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرا کے کوّل وجود میں پیوست کر دیئے تھے ”بس مجھ سے........ اور صرف مجھ سے نفرت کرنا........ کہ صرف میں........ اور بس میں ہی........ تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں........“ ”نفرت........“ چار حرفی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی چبھن چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اُسی لمحے ہوا تھا، لیکن نفرت، زہرا سے نفرت........ یہ اُس نے کیسے سوچ لیا........؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر بہتی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سپنے سچ نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرا بھی تو یہی کر رہی تھی لیکن میرے خواب، اُن کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ ساری رات میں برستی بارش میں زہرا کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ تیز بارشیں کاغذ کی تحریر تو دھو ڈالتی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دُھلے ہیں۔ اگلی صبح کو پہلی اُجلی کرن کے ساتھ ہی بے اختیار اپنے چہرے پر

زمانے بھر کے اندھیرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کا اندازِ ہیجانی تھا ”میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ آپ کسی جھمیلے میں پڑے بنا ہی میرے لیے دُعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی اور جانتے ہیں کہ اب کسی نے سائرہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اُسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ ”دیر“ بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو۔ اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سائرہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نوجوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی تن دہی سے سائرہ کی بے بینا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں پتلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اُس کا آج کل زیادہ تر وقت سائرہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوب صورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے اور دن بدن سائرہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اُس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سائرہ کو اُس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اُس نظر کو کھو دے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اُس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر ٹال رکھیں تو اُس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بُری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں ٹکے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے کچھ حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ساحل کی نم ریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں کچھ ہی دیر میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر اُن کے گھروندوں کو اپنے ساتھ بہالے جائیں گی۔ پھر مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اُجاڑنے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے، اُسے اُجڑ ہی جانا ہوتا ہے، وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آوازے کسے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور دھتکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دُور ایک ٹیلے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اُس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے۔ اور وہ بوڑھا انہی کی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسی شرارتی ہجوم کی طرف تھا، لہٰذا چلتے ہوئے اُسے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اُس فقیر کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ایک گرج دار آواز آئی ”ہٹ جا میرے سامنے سے .... جو خود گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے ....؟“ بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اُس نے زور سے اپنی دراز لٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے میرا وجود اَٹ گیا ہے۔ یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھانہ ماہی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اُسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گمان کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھڑاتی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا ”آپ .... یہاں .... کیسے ....؟“ مجذوب نے بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے ”فقیروں کے لیے زمین کبھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شاندار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے اُس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ ”آپ ہمیشہ آدھی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا،

چاہے کچھ بھی ہو جائے............” میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اُٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جونہی غصے سے زمین پر جھکا، میں نے کسی متوقع گھاؤ کی اُمید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ لیکن وہ ہنس پڑا “تو کیا سمجھتا ہے تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں۔ ضد چھوڑ کر عاجز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔” “میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے............؟” میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آ گیا۔ “بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہے ہی نہیں، اُسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگاہوں اور ویرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ اللہ کا بندہ بھی رُخصت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔” مجھے ایک جھٹکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اُونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔ “ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی تو یوں بیچ بھنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں............؟” مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔ “لڑکے! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اُتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اُس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب فانی ہے۔” میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اُمڈ آیا۔ “ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دُعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دُھندلے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں؟” مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا............ “فنا تو تو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔ ابھی بہت کام ادھورے پڑے ہیں۔” میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کے روؤں۔ اتنا بے بس لاچار، میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا۔ لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر زمین کو بنجر کر گیا۔ مجذوب قدم اُٹھا چکا تھا، لیکن میری بھیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اُسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا “روتا کیوں ہے پگلے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلائے گا............؟” پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی رُوح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب مجھے یوں چپ کرا رہا تھا جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آس پاس سے گزرتے لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہو گی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون............؟ “میں نے کہا تھا نا، تو بہت ضدی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہو گی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ دانا تیری راہ تکتا ہو گا اور ایک بات یاد رکھنا، تو جس خدا کو ان درگاہوں اور ویرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ تیرے اندر موجود ہے۔ تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو دریافت کر............ تیری اس دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ پر تو آخر کار پھر وہیں آ ٹھہرا، جہاں سے چلا تھا............” میں ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب اپنی ہی دُھن میں نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے جب میں درگاہ پہنچا”۔ تو مولوی خضر پریشان سے، میری تلاش میں نکلنے ہی کو تھے۔ “کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو”۔ “کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں یا پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔” مولوی خضر چونکے “کوئی خاص بات............؟” میں نے انہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر

بہت دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔ ”بتائیں نا، ان درگاہوں کا اسرار کیا ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں طے ہے.........؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم ان ویرانوں میں رہ کر خدا سے دُور ہو رہے ہیں یا اُسے پا رہے ہوتے ہیں.........؟“ مولوی خضر کچھ دیر تک میرے چہرے پر جیسے کچھ ٹٹولتے رہے۔

”رہبانیت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی مکڑی دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال بننا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اُس کے بندوں کو کھونا شروع کر دیتا ہے۔ سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔ ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس تمہاری ساری تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اوّلیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا۔ وہ اللہ کے انتہائی قریبی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگاہیں اگر مستند ہوں تو بس اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اعجاز بھلا کسی مقبرے کو کہاں.........؟ تقدیر صرف دُعا سے بدل سکتی ہے اور کون جانے کہ ان درگاہوں پر مانگی گئی وہ دُعائیں جو قبولیت کا شرف پا گئیں وہ اُس کامل یقین کا انعام ہوں، جو دُعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا ویرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ ہجوم میں دل سے دُور......... وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے.........“ میرے اندر مچلتے سوال باہر آنے لگے......... ”تو پھر میں اُسے اپنی شہ رگ سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اُسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھاننا پڑ رہی ہے.........؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔“ ”نہیں میاں! یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے۔ سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے۔ تمہارا راستہ زہرا کے گھر کی پگ ڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشقِ مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے تو قدرت چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے۔“ مولوی خضر جاتے جاتے رُک گئے اور پلٹ کر بولے۔ ”تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر اُدھار رہا۔ ہم اپنی درگاہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں، وقت آنے پر حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی.........اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا کہ میں زہرا کی تلاش میں عشقِ حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبداللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبداللہ کو دوغلے پن کا طعنہ دیتا تھا کہ میں بظاہر اللہ کی راہ کھوجنے والا اب بھی اُسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اُس کی شناخت چھین کر اُسے عبداللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبداللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبداللہ کی راہ کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرا نہیں ملی تو اس میں عبداللہ کا کیا قصور.........؟ اگر ساحر، زہرا کو نہ پا سکا تو اب انتقاماً عبداللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچھائے.........

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ میرے اندر دین اور دنیا میں بٹی ہوئی یہ دُہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرا کی محبت کا

حصول تھا تو یہ کمند تو لب بام ہی ٹوٹ چکی، لہٰذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رُخصت ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس سال بھر سے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا تو اب اُسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرا کو نہیں پا سکا مگر عبداللہ بھی تو زہرا کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ”مات، اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر بنی تو ”جیت“ عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا کانٹا بن چکے ہیں۔ اور دونوں کی بیک وقت موجودگی اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمنے نہیں دے گی۔ زہرا کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کی کسی رُسوائی کا سبب بنے مجھے اس شہر ہی سے کہیں دُور چلے جانا چاہیے کیونکہ میرے دل کا معاملہ زیادہ دیر تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھلنی کرنا ہی جانتی ہے۔ میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ”ذرا دیکھو تو ……… ان درگاہوں کی آڑ میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا ہے ………“ ”ہونہہ! حلیہ تو بڑا مذہبی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھا ہے“۔ ”توبہ ہے بھئی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“ ”یہ شخص تو زرا کافر ہے۔ ماتھے پر محراب سجائے ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرتا ہے۔“ ”اسے تو سنگسار کر دینا چاہیے ……… یہ ایمان کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔ ……… میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینا چاہیں، لیکن کان بند کر لینے سے رُوح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا تو میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھر دے کہ دنیا کی سبھی محبتیں چھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھورے مجازی عشق کو مکمل جنون میں بدل دے تاکہ میں خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دو دھاری تلوار پر نہ چلا میرے رب جو بھی بخشنا ہے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدھی دنیا میں سے کسی ایک کو مکمل کر دے۔ ورنہ یہ آدھا جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں اپنے بقیہ نصف کے حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر دینا چاہیئے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جان نشینی کا تاج اور درگاہ کی ذمہ داری کسی اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ نہ میں ساحر رہا اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ رہنے دیا اور زہرا کی محبت نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا۔ لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی کی آنچ اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پا سکتے۔ بیک وقت دونوں حدوں کو اپنے دل میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جبکہ دونوں ہی معاملوں میں اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کمزور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نابلد ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیتی۔ جانے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو اُدھیڑتا رہتا، اگر بختیار کی آواز میرے خیالات کا تسلسل توڑ نہ دیتی۔ ”کہاں کھوئے ہوئے ہیں جناب! دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں ………“ سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیار کی آمد مجھے کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اُکتا سے جاتے ہیں، تب ایسے میں کسی تیسرے آئینے کی موجودگی ہمیں خود اپنی شبیہہ سے چھٹکارا دلا جاتی ہے۔ لیکن خود بختیار کا کانچ آج کرچی کرچی محسوس ہو

رہا تھا۔ اُس نے نہایت پریشانی اور دُکھی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اُس نوجوان مجسمہ ساز نے سائرہ کی جڑاؤ آنکھ کی پتلی ڈھونڈ لی ہے اور اسی ہفتے وہ سائرہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی رکھتا ہے۔ سائرہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُسے اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مربی بختیار کو بھی دیکھ سکے گی، جس نے اُس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی سائرہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اُسی طرح اُس کا تمسخر اُڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اُڑاتی رہی ہے۔ میں نے تحمل سے اُس کی ساری بات سنی۔ ”مجھے افسوس ہے اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، لہٰذا اگر میری دُعا میں خدا نے کوئی تاثیر رکھی بھی تھی تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے۔“ بختیار ہکا بکا سا رہ گیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پہ پہنچ کر پھر سے رختِ سفر کیوں باندھ رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدارا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”کچھ لوگوں کا مقدر سدا مسافت ہی رہتا ہے۔ اُن کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا ”فریفتہ“ ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیڑ میں کھو جانا ہے۔“ جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا ”کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں اور آج آپ سے ایک آخری دُعا کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دُعا بھی نہیں کریں گے.........؟“ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ دُعا صرف انسان کے اپنے کامل یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی.........“ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا ”آپ دُعا کریں کہ میرا رقیب مر جائے.........“ میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں کسی کی موت کی دُعا کیسے کر سکتا ہوں؟“ بختیار روہانسا ہو گیا۔ ”تو پھر آپ یہ دُعا کریں کہ سائرہ کو بصارت ملنے سے پہلے میں مر جاؤں۔ آپ نہیں جانتے، رقیب لفظ کی دھار ہی کسی دل جلے کے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی دوسرا عذاب ہے۔“ میں چونک گیا۔ میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہر کی کڑواہٹ سے آشنا، مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہماری طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں ٹک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اُس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کروا دی کہ مجھے اُس کے لیے کوئی ”منت“ مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ گویا تمہاری دُعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔“ میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا ”کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دُعا سن لے گا۔ جبکہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دُعائیں خود سائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آ کر دُعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہِ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھا دیتے کہ اسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکھٹ پر بھی ماتھا رگڑیں گے تو خدا اُن کی ضرور سنے گا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگاہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔“ ”ٹھیک کہتے ہو میاں......... لیکن اگر ایک شخص اتنی دُور چل کر، اس اُمید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ تم اُس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اُٹھا کر اللہ سے دُعا مانگ لو گے تو ایسی دُعا میں بھلا کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے اللہ ہم گناہ گاروں کی صرف اس لیے سن لے کہ اُس کا ایک مجبور بندہ دُعا کی آس میں اتنی دُور چل کر آیا ہے۔ کون جانے اُس

کی دُعا کی قبولیت گھر بیٹھے نہ لکھی ہو۔ یہاں تک چل کر آنے کی سعی کے بعد ہی لکھی ہو۔ اور کبھی کبھی خدا اپنے کسی خاص بندے کی دُعا میں اثر بھی ڈال دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے، عبداللہ میاں بھی اُنہی خاص بندوں میں سے ایک ہوں۔'' مولوی خضر میرا سر تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے ظہر کی نماز کے لیے چل دیئے۔'' دفعتاً مجھے درگاہ کے دروازے کے پاس سے مجذوب کی آواز سنائی دی ''اپنی رُخصت کا وقت ہو گیا ہے لڑکے! تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو، آ گیا ہوں۔'' میں جلدی سے باہر نکلا تو وہ سیڑھیوں سے پرے کھڑا تھا'' آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اُس نے سر جھٹکا '' سب ہی کو ایک دن جانا ہے، تو بھی تو جا رہا ہے۔.........'' میں چونکا، وہ اپنی دُھن میں بولتا رہا۔'' بس ایک بات یاد رکھ، لڑنا چھوڑ دے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف اپنا ماتھا ہی پھوڑے گا اور کچھ نہیں۔'' میں نے زخمی نگاہ اُٹھائی'' اپنی پیشانی کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ ہاں اس گھاؤ سے اُڑتے خون کے چھینٹے کسی کے اُجلے دامن کو داغ دار نہ کر دیں، بس اس بات کا ڈر ہے۔ اِسی لیے جا رہا ہوں۔'' مجذوب نے غور سے مجھے دیکھا، اتنا بُزدل دکھائی تو نہیں دیتا۔ تو تو دوسروں کو بھسم کرنے والوں میں تھا۔ پھر خود جل کر راکھ کیسے ہو گیا؟'''' میں تو سدا کا راکھ تھا، پتا نہیں، یہاں کے لوگوں نے مجھے چنگاری کیسے مان لیا.........؟'' میری کپکپاتی آواز نے جانے اُس پر کیسا اثر کیا کہ وہ جلال میں آ گیا'' تو کہے تو ابھی فیصلہ کرا دوں، تجھے دنیا چاہیے نا......... جا میرے مالک نے آج سے دنیا تیرے نام کر دی۔ وہ تجھے مل جائے گی، لیکن اب کی بار چوکا تو پھر کبھی فریاد نہ کرنا۔ وہ تجھ سے صرف ایک بددُعا کی دُوری پر ہے۔ تجھے اُوپر والے سے یہی گلہ تھا نا کہ اُس نے تجھے آدھا دین اور آدھی دُنیا کیوں دی۔ جا......... آج سے تیری دنیا پوری کر دی گئی ہے۔ اب آگے تیری اپنی ہمت ہے۔'' مجذوب ایک جھٹکے سے مڑا اور مزید کچھ کہے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے سب قضا ہو گیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے درگاہ لوٹ آیا، جہاں مولوی خضر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے'' خرم کے گھر سے پیغام آیا تھا میاں! اُس کی حالت گزشتہ رات سے کافی ابتر ہے۔ جانے اُس کے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی ہے کہ وہ اگر صحت یاب ہو گا تو صرف تمہاری مسیحائی سے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانا چاہیے۔'' میرے ذہن میں مجذوب کی آواز گونجی'' وہ صرف ایک بددُعا کی دُوری پر ہے.........'' میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اچانک درگاہ کے دروازے پر خرم کی ماں بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔ جانے کیوں اُن کی حالت دیکھ کر میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہو گیا۔ خرم کی والدہ میری جانب لپکیں۔'' جلدی چلو۔ عبداللہ بیٹا......... خرم کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ میرے بچے کو اب صرف تم ہی بچا سکتے ہو۔'' میری نظر مولوی خضر کی نظر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا، مجذوب کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔

❀......❀

’’کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا‘‘

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کہی باتوں کی بازگشت نے گھیر رکھا اور پھر خرم کے سرہانے زہرا کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اُس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا طبی تشخیص کے مطابق حادثے کے بعد اگرچہ خرم کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا گیا تھا، لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم دن بدن نڈھال ہوتا گیا اور اس کا ہر چوبیس گھنٹے بعد پلٹنے والا بخار اب دن رات مستقل اُس کا وجود پُھنکا تا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی سی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ اُن کی آخری اُمید بیرون ملک سے منگوائی گئی ایک خاص ویکسین تھی، جو اگلی شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود خرم اپنی ہر اُمید تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اُس کے جلتے بدن اور سلگتی رُوح کو اگر چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی تو وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑھے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند مخصوص آیات پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دیں اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ کچھ پل کے لیے اُس کی انگارہ سانسوں کو قرار سا مل گیا۔ میں بغور اُس کی حالت دیکھتا رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ’’میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ.........تم میرے لیے دعا کرو گے نا۔‘‘ ’’تمہاری جینے کی خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کی ضرورت ہے۔‘‘ اُس نے سر جھٹکا ’’نہیں.........مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحائی کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دُور کہیں میری رُوح سے جڑے ہو۔ کچھ ناطہ تو تم سے ایسا ضرور ہے جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے درد کی ہر دوا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اس بار بھی تم نے میری مسیحائی نہیں کی، تو میں مر جاؤں گا۔‘‘ خرم کی بات سُن کر اُس کی ماں رو پڑی۔ میری نظر اُٹھی اور زہرا کی ڈبڈبائی نظر کا سارا ترش نمک میرے حلق میں اُنڈیل گئی۔ پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں چپ چاپ باہر نکل آیا درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں صحن کے چوبارے پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ’’کہو میاں، کچھ آرام آیا تمہارے مریض کو.........؟‘‘ ’’آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا۔ آخر اُن سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔،، مولوی خضر نے غور سے میری جانب دیکھا،، جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی دعا نہ دینے کا مطلب بددعا دینا بھی ہو جاتا ہے۔،، میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرا مجھ سے صرف ایک بددعا کی دُوری پر ہے۔ تو کہیں، یہ وہی بددعا تو نہیں۔ یہ کیسا ستم ہے کہ قدرت

نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے میں رکھ چھوڑی تھی۔ اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کر دی گئی تھی۔ بھلا کوئی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے چبوترے پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دُھندلا ستارہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری دُھند تھی اور وہی اِک نیا دُھندلا جہاں بانہیں پھیلائے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے صحن میں ملزم بنا کھڑا تھا اور میری فردِ جرم پڑھ کر سنائی جا رہی تھی ''یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے لیکن اس کا اندر شدید آلودہ اور کالک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں سرگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی چاہت میں در بدر ہے۔ یہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے اور ایسی مقدس چار دیواریوں کے بیچ بس اُس ایک چہرہ کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے سب ہی سرد و گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے اٹا رہا۔ اس کا دل کبھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔ تو بولو، ایسے گھناؤنے جرم کی سزا کیا ہونی چاہیے؟'' سارا مجمع چلانے لگا ''اسے سنگسار کر دو۔ اسے مار ڈالو۔'' چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر خود کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ ''ٹھہرو، مجھے مت مارو.......... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کرایا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی اعلانِ بزرگیت نہیں کیا، پھر مجھ سے پاکیٔ داماں کا تقاضا اور اُمید کیوں..........؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اس گناہ محبت کے داغوں کو کھرچا نہ جا سکا تو اس قدر واویلا کیوں؟ ایک بے اختیار، کو سزا کیوں؟'' میں یوں ہی چلاتا رہا اور تب ہی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سویرا ہونے کو تھا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی اُبھرتا جو دلوں کے اندھیرے دُور کر پاتا۔ دن چڑھے بختیار بھی آ پہنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے آتے ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ''آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے..........؟ میں نے اُس سے پوچھ لیا'' کیا محبت خود غرض بھی ہو سکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔'' بختیار میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اُٹھا۔ ''سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں.......... کہ محبت کے بنا بھی تو صرف فنا ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روز مرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند پل جینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اُسے کسی رقیب کی بھینٹ کیوں چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لئے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کمزور جذباتی لمحے کی نذر ہو کر برباد نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہو گی۔'' بختیار اپنی دُھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں..........؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لئے بھی قدرت کے کشکول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے

ہاتھوں لکھ دیا گیا ہے تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُراُمید نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیے۔ بختیار پر شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ جیسے واقعی میری دعا ہی اُس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہوسکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامراد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھرا تو بختیار سے رہا نہ گیا۔ ''آپ نے میرے لیے کیا مانگا۔'' مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔ ''میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے.......... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایثار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کاندھوں پر رکھ دے۔'' بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہوگیا، جو پرانا کھلونا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بہلاوے میں آ کر رونا بھول جاتا ہے لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا ہے، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا اور کسی بہلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کو نئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اُس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اُس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی مان اتنا اہم ہوسکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہرا کھو دیتا۔ اس کش مکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیئے اور جب میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا تو صحن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور اُن کی تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش تب آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں بھگوئی پٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے حجرے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کی تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا ''لیٹے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔'' میں کسمسایا۔ ''لیکن.........'' مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ''اس کام کے لیے اب دیر ہوچکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں لیکن تم اُس وقت ہذیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر اُنہی کا ڈرائیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔'' میں نے بوکھلا کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ''میں کچھ زیادہ ہذیان تو نہیں'' ''نہیں.......... وہ کچھ نہیں سمجھیں .... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہرحال، وہ نامراد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔'' میں نے تھک کر تکیے سے سر ٹکا دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کمزور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی اَن ہونی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کش مکش بھانپ گئے۔ ''خود سے اتنا نہ لڑا کرو عبداللہ میاں! دل پھٹ جائے گا تمہارا۔ سب اُوپر والے پر چھوڑ دو۔'' لیکن کاش، یہ کلیہ میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے تو لڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کسی کو نیند کی صورت اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیر اثر تھک ہار کر پلکیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر حجرے سے نکل کر باہر

گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ''ساحر۔'' مجھے یوں لگا جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی گہرے پانیوں کو کاٹتی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اُس آواز کو میں لاکھوں کروڑوں کے ہجوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرا کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سرہانے کھڑی تھی۔ ....؟'' ہاں............ وہ زہرا ہی تھی کچھ دیر کے لئے زمان و مکان کی ہر حرکت رُک سی گئی۔ میری نظر اُس کی بھیگی نظر سے ٹکرائی اور مقصد حیات تمام ہوا۔ اس کے یاقوت لب پھر سے ہلے۔ ''ساحر............ آپ ٹھیک تو ہیں............؟ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اُس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا اپنا آپ مٹا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر ڈبڈبائی ہوئی کیوں تھی۔ اُس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور حجرے سے باہر درگاہ کے صحن میں بھی کسی عورت کی دبی دبی سی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ اَن ہونی پیش تو نہیں آ گئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ''عبداللہ میاں............ زہرا بی بی تمہیں لینے کے لیے آئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ اُمید اپنے آخری دم پر ہے۔ باہر صحن میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملائے بنا حجرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے ایسے کسی بدنصیب گھائل کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں پانی کی بچی ہوئی، آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہو اور تب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جان بہ لب بدنصیب کی نظر سے زہرا کی جانب دیکھا۔ اُس کی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تقاضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے خنجر کی چمکتی دھار کو اپنے جگر کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ لبوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرا کپکپاتی آواز میں بولی ''آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں اُن سے کہتی ہوں کہ............ رُک جائیے............ قیدی اگر تختہ دار تک نہ جا سکے تو پھانسی ملتوی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' اندر سے آتی ہوئی آہٹوں کی آواز سن کے خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سمیٹے پڑا رہا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے بکھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیسا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑ گئی تھی کہ اُسے میری دعا ہی سے مسیحائی نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا جو کھلتا نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ سورج مکھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سرہانے پڑی چھوٹی میز پر درآمد شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اُسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اُس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُس کے پریشان کھڑے والدین کی طرف

دیکھا۔ ”دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک آ گیا ہوں اور اُوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں۔ خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔“ خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی ان باتوں پر اعتبار نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے لڑ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان احمقانہ باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین ویکسین اور تمام قابل ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی تھی لیکن سر شام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہے۔ اس لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔“ مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کس مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اُٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے۔ ”مجذوب.........“ ”خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔ ”ہاں......... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو گئے تھے، وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں اٹا بیٹھا تھا۔ اُس نے خرم کو دیکھتے ہی بنا اُس کی بیماری یا تکلیف جانے فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہو گی۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ اُس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔“ میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ ”یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اُس مجذوب سے ملی تھیں“ ”یہ اُسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب کبھی دکھائی نہیں دیا۔“ میرے وجود میں بیک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہرہ تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سمائی کہ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکی سی لی اور اُس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے تسبیح ختم کر دی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ”اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سرہانے آ کر ایک دعا پر ہی ختم ہونا ہے تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے جدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔“ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لیے۔ ”یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کمزور اور ناشکرا بندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ تو نے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا یقین کامل پیدا کیا ہے تو اب تو ہی اس دعا کا پردہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ......... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا۔ تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بخوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب ﷺ کا واسطہ، تجھے اس ستر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدقے اس مجبور ماں کی بھی سن لے جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سر ٹکراتی پھرتی ہے، اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدقے مجھ جیسے عاصی کی دعا سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دُور فرما کر اسے شفا عطا کر دے۔ میں

جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دنیا پرست اور گناہوں سے لتھڑے انسان کی تمام خامیاں اور کمزوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں لیکن تیری رحمت اور تیری لازوال عطا کسی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا رحم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔’’ میں دل ہی دل میں گڑگڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رُخصت طلب کی۔

ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر کمرے سے نکلتے نکلتے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آگئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ‘‘مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس، عبداللہ ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ جیتے رہو۔’’ مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس ہارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھے گیا، جو اپنی آخری جمع پونجی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی بھینٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا حتیٰ کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر سی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری ‘‘میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔’’ میں نے قریب پڑا کھیس شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آ گیا اور پریشانی سے بولا ‘‘یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے، ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔’’ ‘‘ہاں.........شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ لیکن آج ماشاءاللہ آپ کا چہرہ خلافِ معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہو گئی ہے۔’’ بختیار نے فرطِ عقیدت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ‘‘یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے حصے کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سائرہ نے آپریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔’’ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا ‘‘کیا.........؟ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا.........؟’’ ‘‘پتا نہیں۔ آپ شاید اسے میری شدید خود غرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت سے زیادہ خود غرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہوگا بھی نہیں۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خود غرض نہ ہو۔ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سائرہ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں تو میں اُس کے سامنے خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رو پڑا۔ وہ پریشان ہو گئی اور مجھے اسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سائرہ کو کھو دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بدصورت ہوں، یہ سن کے تو وہ پہلے ہکا بکا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رُو پڑی کہ میں نے اُس کی عقیدت کو اتنا ناتواں کیسے جانا۔ اُسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے جو میرے بقول اُس سے میرے حصے کی نظر چھین لے جائے گی۔ اس کے اس فیصلے نے جانے کیوں پر مجھے بہت رُلایا۔ میں اور سائرہ بہت دیر تک روتے رہے۔ لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔’’ بختیار نہ جانے کیا اور کیا کچھ بتاتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی اٹک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خود غرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے

بختیار پر رشک آرہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خود غرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خود غرضی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور دوپہر تک اُس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے درآمد شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے۔ لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا۔ اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملا تھا۔ کتنا شان دار پلاٹ بنایا تھا اُس نے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو، خرم کے والدین کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ ''اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر سہرا سجاؤں گی اور آپ سب کو آنا ہوگا۔ اور عبداللہ تم بھی تو میرے بیٹے ہو نا، تو تمہیں خرم کا شہ بالا بننا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا، دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔'' وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ اُن کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رقصاں تھا۔ اُن کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ ''میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبداللہ کو منتخب کر لیں۔'' میری آواز آنسوؤں سے رندھ سی گئی۔

مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا ''ٹھیک ہے اگر یہی رضائے خداوندی ہے تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو ٹھہر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔'' ''جو آپ کا حکم۔'' میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا۔ ''اور ہاں عبداللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر۔ تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا بسیرا ان درگاہوں اور ویرانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو تو شہ رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اُس کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ، ویرانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھید بھی بتانا ضروری ہو گیا ہے۔ میں.......... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم.......... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبداللہ، حاکم یا سلطان نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اتنا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا۔ درگاہ سے پھانسی گھاٹ، پھر یاقوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ''خدا کا تعارف..........، اُس کے بندوں کے ذریعے، اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بخوبی نبھایا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے.......... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔'' مولوی خضر پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں چبوترے پر ڈھے سا گیا۔ وہ اگر میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن

جسے میں نیند سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جاگنے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معما ہی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہی مہربان لمس محسوس ہوا جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں! وہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی ملیح سی مسکراہٹ، وہی مہرباں احساس۔ میں رو پڑا ”کہاں چلے گئے ہیں آپ.......... آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبداللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔“ وہ تو مسکائے ”اچھا تو گویا عبداللہ اپنے سلطان بابا سے روٹھ گیا ہے، لیکن میرا ساحر تو مجھ سے خفا نہیں نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟“ ”آپ جانتے ہیں کہ عبداللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی۔ پھر آپ نے میرے اندر کے عبداللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبداللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟“ ”تمہیں ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فنا ہی دوسرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر آدھا ساحر اور آدھا عبداللہ بستا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف پیغمبر کا نصیب ہوتی ہے۔“ میں سسک پڑا ”تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں۔“ سلطان بابا پھر سے مسکرائے ”بس.......... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مرد و زن کی آپسی کشش فطرت کی طے کردہ ہے۔ میں، تم.......... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی رشتے کی پیداوار اور نتیجہ ہیں۔ ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندھن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاور یا متولی کی شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی شادی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، رہبانیت سے بچو گے تو دنیا پرستی کا الزام لگائے گی اور دنیا داری سے دامن چھڑاؤ گے تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضامندی کے لیے اپنایا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اور ہاں، عبداللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو تمہارے نصیب کا جو، تم تک پہنچ کر رہے گا۔ اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔“ سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دُھند میں کھو گئی۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغام رسانی کے ذریعوں میں سے ”ایک“ مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر متشکر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بنا زہرا ہی کے میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دیے۔ شاید وہ تمام انتظام کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ سہ پہر تک میرے بعد والا عبداللہ نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا ان در و دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شناسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبداللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبداللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے پلٹ جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اور پھر عصر کے وقت وہ سواری بھی آ پہنچی جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیظ و غضب کے ساتھ۔ لیکن آج اُن کے لبوں پر ایک عجیب ہی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے گلے لگا لیا۔ ”کیوں بھئی نوجوان.......... واپس چل دیے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر

دیکھو..........ہم خود تمہیں رُخصت کرنے یہاں چلے آئے۔" میں خاموش رہا لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں کیوں کہ اُن کا ہدایات دینے کا انداز اور اُن کی ہر معاملے پر گہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رُخصت چاہی، کیوں کہ میں مما اور پپا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور اُن کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ وداع بھی میرے لیے کسی خنجر کی دھار کی طرح تھا۔ رُوح میں پیوست ہونے والی دھار.......... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے "جب جب جو ہونا ہے.......... تب تب سو سو ہوتا ہے۔" "جا رہے ہو میاں! چلو ٹھیک ہے تمہارا استقبال کرنے والے بھی آ پہنچے ہیں۔ اور ہاں.......... گھر پہنچ کر اس رقعے کو کھول کر پڑھ لینا۔ انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لفافہ تھا، جس کے بارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مما کی آواز اُبھری "ہم آ گئے ہیں بیٹا.........." میں نے میکانی انداز میں گردن گھمائی اور پھر مما پپا کے ساتھ وہیل چیئر پر بیٹھے خرم اور اُسکے والدین کو ساتھ کھڑا دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ "آپ سب یہاں..........؟" تب خرم نے اپنی وہیل چیئر دھکیلی اور میرے قریب آ گیا۔ اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ "واہ میرے مسیحا! ساری مسیحائی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کسی مرحلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائیں تو اُن کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ہے ساحر۔" خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سن کے مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے مما پپا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرا کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اُس کے والدین پر یہ بھید ہرگز نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار اُن میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں نبھا پایا تھا۔ خرم میری نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ "نہیں.......... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور اُن کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا۔ اگر کل سہ پہر یہ تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔" خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے پپا کے ہاتھ زہرا کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زیرِ لب دہرایا۔ "جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.........." پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھے گئے، میرے نام پر اپنی اُنگلی رکھ دی۔ "یہ نظم تمہاری ہے نا ساحر.......... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر.......... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے.........." میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دوپہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا تو کئی دنوں کی اکتاہٹ آمیز تھکن اُتارنے کے لیے اُس نے اپنی ماں باپ سے کھلی فضا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا لہٰذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرا کی حویلی میں اُتار دیا جائے تا کہ وہ زہرا کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کا اُردو ادب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُردو ادب زہرا کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اُس کی کمزوری ہے، لہٰذا اُس نے زہرا کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اُٹھالی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اُس کی گود میں جا گرا۔ خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرا کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اُس سے پوچھ لیا کہ یہ "ساحر" کون ہے؟ یہ سوال زہرا کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے چہرے کے بدلتے

رنگ نے خرم کے تجسس کو مہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جا سکتا تھا، بڑھتی چلی گئی۔ زہرا نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی۔ لیکن اگر بات ختم ہی ہونا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اُٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری کتاب کیوں نہ اُٹھائی؟ کچھ مسودے قدرت صرف خالص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرا کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبداللہ، جو گزشتہ رات خرم کی مسیحائی کے لیے اپنی شدید ابتر حالت کے باوجود اُس کے سرہانے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرا نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اُجالا ہونے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں اس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو۔ لیکن یقین جانو.......... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔“ میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں ”ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔“ خرم کی والدہ آگے بڑھیں ”نہیں.......... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبداللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرا تمہاری امانت تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جانی تھی اور اب عبداللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری مما سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔“ انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مما پپا میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے گرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پل بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے رُوٹھے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جائے گی۔ زہرا کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پپا نے میری نظروں کا مفہوم جان لیا۔ ”زہرا ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا.......... وہ نیچے ساحل پر ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں لہٰذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرا کا ساتھ چاہتے ہو۔“ خرم نے مجھے جھنجھوڑا.......... ”جاؤ عبداللہ.......... دیر نہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو چوکنے نہ دینا۔ بہت زخم کھا لیے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم.......... جاؤ تمہارا امر ہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے..........“

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چنتا ہے، وہی اُس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبداللہ.......... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے تو شاید یہ نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخرو کھڑے ہو تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ، تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ”ہم سے رُخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں.......... جانے پھر کب ملاقات ہو..........؟ میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔“ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری

http://kitaabghar.com

رُخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرا کے نام کا تقدس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کارفرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گا۔" حاکم بابا بولے۔ "جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے.......... اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے.........." میں اُن کی بات سن کے روہانسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاکم بابا بولے۔ "مولوی صاحب.......... بہت ستایا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔" مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ "عبداللہ میاں.......... تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خالی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لفافہ جواب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہو.........." میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عجلت میں اپنی جیب سے وہ لفافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے ویسی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبداللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں پرچی کھولی تو اس میں لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام.......... اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے عبداللہ.......... تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا.........." میں اپنی آواز سے چھلکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ "گویا میں اب بھی عبداللہ ہوں.......... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا..........؟" مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبداللہ صرف درگاہوں اور ویرانوں ہی میں نہیں.......... زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کی حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی اور یہ دونوں فرائض تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، اُن کے لیے ضرور کرنا، جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جت جاؤ تاوقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا مراسلہ مل جائے۔ ہم تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود ہیں رہیں گے.........." حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبداللہ) نے فرداً فرداً مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ہی ساحل کی جانب چل پڑا۔ مما پپا، خرم اور اُس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رُک گئے اور میں لرزتی دھڑکن لیے دُور ڈوبتے سورج کے پیش نظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرا کے قریب پہنچ کر کچھ قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ کہتے ہیں کچھ لمحے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جن کا انتظار خود "وقت" کرتا ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اُس "ماہ تاب منتظر" کی پلکیں اُٹھیں اور پس منظر میں ڈوبتا سورج یک لخت مدھم پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری نبض چل رہی تھی۔ میں نیند میں تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے سج گیا تھا۔ زمین بہنے لگی تھی یا سمندر ساکت ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرا کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے کو دمکا رہی تھیں۔ یا یہ زہرا کے چہرے کا نور تھا جو ان کرنوں کو مزید اُجال رہا تھا۔ ہم دونوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی لہروں نے ہماری خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراتی ہوا نے اَن کہے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیے۔ زہرا کی آنکھوں نے کہا۔ "آپ آ گئے ساحر.......... میں کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی تھی.........." میں نے بند لبوں سے جواب دیا.......... "میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا.......... آپ کی راہ کی دھول بن کر.......... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دُھول۔" اُس کی گھنیری پلکیں تڑپ کر جھپکیں

''نہیں............آپ میری راہوں کی دُھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کاجل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں جس راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کبھی منزلیں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔'' ہم دونوں بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اضافی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھلملاتے سمندر کا عکس ہماری بھیگی پلکوں سے جھلک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دُور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اُسے یہی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات نہیں رہی۔ مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست بھلا خاموشی کی باتیں کیا جانیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرزِ تکلم اور تخاطب کی خوبصورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب محوِ سماعت ہوں تو بھی کمال خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اُس لمحے وہ خاموش پری۔ اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی کی آنکھیں، جھکتی پلکیں، جبیں پر پسینے کی بوندیں، لرزتے بندِ لب اور کسی کی خم کھائی زلف کا بل بھی تو ہماری اَن کہی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔ میں اور زہرا بھی اس وقت مجسم سماعت تھے، ہر اُس اقرار، ہر اُس پیمان کے لیے، جو ہم نے لبوں سے ادا نہیں کیا۔ پھر بھی ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دُور ٹیلے سے مما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ ''عبداللہ............دیر ہو رہی ہے بیٹا............چلو گھر چلیں............'' میں نے زہرا سے کہا............''چلیں سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔............'' اس ناز آفرین نے پہلا قدم اُٹھایا لیکن میں رُک گیا۔ لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھایئے گا کہ عبداللہ کی مسافتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں............تھک تو نہیں جائیں گی............؟'' زہرا دھیرے سے مسکرائی۔ ''ڈرا رہے ہیں یا تنبیہ کر رہے ہیں............'' میں بھی مسکا دیا۔ ''صرف اپنے نصیب کی بھول بھلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔'' تب زندگی میں پہلی مرتبہ، زہرا نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ''اب جو عبداللہ کی راہ ہے............وہی زہرا کا رستہ ہے............جب مقدر جڑ جائیں تو نصیب کی گرہیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں۔ آپ زہرا کو ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔''

دُور سمندر کے اس پار اُفق پر سورج ڈُوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے اور زہرا میرے پیچھے چل پڑی۔ میرے نقشِ پا پر اپنے نازک قدم دھرتی............پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ کر لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔ ''نئی مسافتیں............نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست............آنے والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام............اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع............الوداع عبداللہ............الوداع............''

http://kitaabghar.com

* * *

ختم شد

* * *